



U32307

Title - Naqish Maan

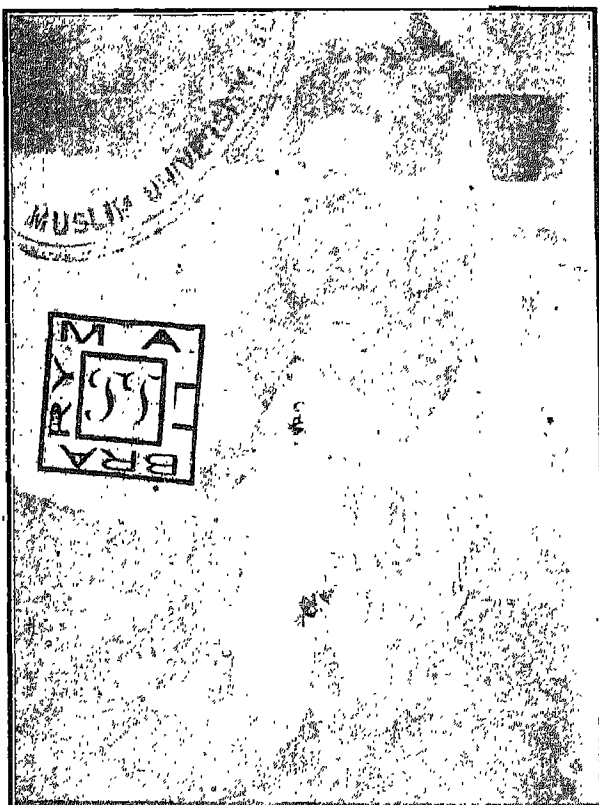
Author - Sayyed Kabb Ahmad Maan Jaysi

Publisher - Net Available

Date - 1351

Pages - 174

Subject - Urdu, Sharqi - Kulliyat - O - Darul Uloom

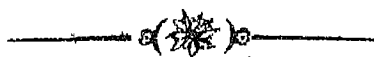


میں وہ ہوں کہ رہبر و عشق کو نہ رہی ضرورت رہتا
 کہ ہیں میرے بچہ بیخودی کے نقوش راہ نیا نہیں
 مانی۔ جانی

مئی ۱۹۳۲ء

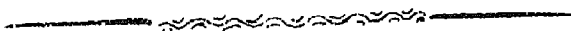
نقوشِ مانی

جملہ حقوق محفوظ ہیں



جس کتاب پر

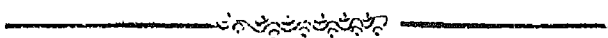
مصنف کے دستخط نہ ہوں وہ مسرقت تصور ہوگی



مطالعے سے پہلے

براہ کرم غلطیوں کی اصلاح فرمائیے

صحت نامہ اس ورق کے بعد منسلک ہے



قیمت فی جلد مع محصول ڈاک - دو روپے

صحت نامہ نقوش مانی

صفحہ	غلط	صحیح	نوٹ
۱۳	اک	ایک	صفحہ ۱۲ پر ۱۔
۲۰	بارگاہِ عیش	بارگاہِ حین	تختیں کے سبداول کے بعد۔
۱	قفس	قفس میں	لازم ہے یہ کہ زیر قدم ایسی راہ ہو
۱۱	نہ امید	بہ امید	منزلِ نجات جس کی ہو مقصد نہا ہو
۱۲	کیا کروں	کیا کہوں	کیوں عیشِ عارضی کے لئے یوں تباہ ہو
۷	تم کو	تم	دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو
۷	حیاں سے	آج سے	میری سنجو گزشتہ کیفیتِ نیش ہے
۵	باطل	باطل	اور
۱	باا	ہاں	سبندِ سیوم کے بعد۔
۱۰	جود	وجود	میں کیا تاؤں محفلِ عشرت کا تھا جو رنگ
۸	رحمتِ ستم	رحمتِ کرم	زینتِ خراسانِ صدرِ حسنین شہنشاہِ رنگ
			محوِ نظارہ مجمعِ عشاق بیدِ رنگ
			لطفِ ظلمِ ساقی و ذوقِ صدائِ چنگ
			یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گزشتہ ہے
			اضافہ فرما لیجئے۔

سچانہ

دیباچہ

تمہید | کریم النفس انسان بالطبع دل نواز ہوتا ہے، اور محبت کرنے والا
اتیاز نیک و بد سے بے نیاز۔

اس کتاب کی اشاعت ایسے ہی حضرات کے اصرار اور فرمائش
کی ممنون ہے، ورنہ ساری عمر کی کائنات اتنے مختصر سے مجموعے کو نالاش گاہ
علم و ادب میں پیش کرنا کوئی بڑی خوش آئند بات نہ تھی، خصوصاً جب میں
اسے اہل نظر اور ارباب ذوق کے لئے ناقابل التفات بھی،
سمجھتا ہوں۔

اختصار کے لئے تو خیر اکت عذر ہو سکتا ہے کہ ایک مجموعہ
۱۹۰۶ء میں اور دوسرا ۱۹۱۴ء میں ضائع ہو گیا۔ پہلے مجموعے
۱۹۰۶ء میں اصرار کرنے والوں میں برادر عزیز سید گلبدن مصطفیٰ صاحب مکہ المدنی۔ لے کا نام علی حروف میں لکھا۔

(ب)

کے دو ہی چار شعر یاد رہ گئے ہیں اور چونکہ وہ متفرق ہیں اس لئے اس کتاب میں شامل نہیں کئے گئے۔ ہاں دوسرے مجموعے میں سے جو کچھ یاد آسکا وہ درج ہوا۔

ایک اور سبب بھی اختصار کا ہے، یعنی یہ کہ میری شاعری ہمیشہ جذبات کی تابع رہی، آپ ملاحظہ کریں گے کہ ہمیںوں بلکہ بعض اوقات ہر سوں شعر کہنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا، اور یہ حقیقت تاریخ تصنیف سے واضح ہوگی جو ہر تصنیف کے شروع میں لکھ دی گئی ہے۔

اسلوب ترتیب میں نے اپنا کلام تاریخ کی ترتیب سے جمع کیا ہے جس کا ایک ضمنی فائدہ تو وہ ہے جو اوپر عرض کیا گیا لیکن اصل غایت اس اسلوب ترتیب کی یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ، تغیرِ حالات اور ترقی

لہ مثلاً۔ کیا مٹے درد، وہ بے درد، میں لذت کش درد

اُس نے ٹٹنے نہ دیا، میں نے مٹانے نہ دیا

یا۔ جیسی آئینہ سی صورت تجھے دی ہے اُس نے

ایسا آئینہ سا دل تجھ کو خدا نے نہ دیا

یا۔ جنوں چنوا رہا ہے اب یہ تنکے ورنہ اسے مانی

خدا! اگر وہ پھر قصدِ بنائے آشیاں کیوں ہو۔ وغیرہ

(ج)

مشق کے جو آثار رنگ طبیعت، جذبات اور کلام پر مرتب ہوئے ہیں، ان کا اندازہ مطالعہ کرنے والے کو ہو سکے، اور شاید یہ اندازہ مطالعے کو کھپ اور ایک حد تک مفید بنا سکے۔

اعتراف | یوں تو نکتہ میں نگاہیں اور دقیقہ سنج طبائع خدا جانے کتنی فروگزاشتیں اس ناچیز مجموعے کے ہر شعر میں پائیں، لیکن بعض خاص امور کی طرف میں خود ملتفت کر دینا چاہتا ہوں۔
(۱) دو ایک مقام پر شاگکاں ہے۔

(۲) دو ایک شعروں میں ”نہ“ کی ممنوں میں ”سنت“ استعمال ہوا ہے جسے متروک سمجھا جاتا ہے، اسی طرح کئی جگہ ”سو بھی تلم ہوا ہے۔“
(۳) برق یا بجلی کے لئے ”گرنا“ عموماً استعمال ہوتا ہے، میں نے غالباً دو ایک شعروں میں ”ٹوٹنا“ استعمال کیا ہے۔

(۴) ”وہاں“ کی جگہ ”واں“ اور ”یہاں“ کی جگہ ”یاں“ تو جہاں تک مجھے خیال آتا ہے، اس مجموعے میں کہیں نہ ملے گا۔ اگر ”کے بجائے“ ”درگر“ کا استعمال بھی تقریباً سولہ سال سے میں نے ترک کر دیا ہے۔

امتنان | میں ان فاضل اور ادیب دوستوں کا بدرجہ غایت ممنون ہوں جنہوں نے ازراہ کرم رواج عام کے مطابق اس ناچیز مجموعے کو بھی مقدمے سے زینت بخشنے کا خیال اور قصد ظاہر فرمایا۔ لیکن میں تو

اپنی ان چند سطروں کو بھی جگہ نہ دیتا اگر اس قدر ضرورت محسوس نہ کرتا۔

مزید تفصیل کا سبب میں دیا ہے کہ ختم کر چکا تھا کہ اتفاق سے شفیق منظم جناب شوکت علی خاں صاحب قانی۔

بدایونی (بی۔ اے، ایل ایل۔ بی) سے ملاقات ہوئی۔ وہ مندرجہ بالا سطور کو ناکافی خیال فرماتے ہیں، اور بصر میں کہ دیا ہے ایسا ہونا چاہئے جس سے مصنف کے سوانح حیات تفصیلاً نہیں توجا جائے ضرور معلوم ہو سکیں۔ خیر، جو کچھ یاد آتا ہو لکھے دیتا ہوں۔

نسبی حالات راقم کا سلسلہ نسب دادھیال اور نانہیال دونوں طرف سے امام دہم حضرت علی نقی علیہ السلام تک منتہی

ہوتا ہے۔ نانہیال میں تو خیر شاہانِ اودھ کے زمانے میں بہت کچھ ثروت رہی، لیکن دادھیال والے ہمیشہ استغنا برتتے رہے، اور باوصف امکان کبھی

۱۵ جدِ اعلیٰ مولوی سید ابراہیم علی صاحب اعلیٰ القادری عیدِ اوزنگ زیب میں شاہزادوں کے اتالیق تھے۔ نولاکھ روپیہ محاصل کی جاگیر عطا ہوئی، ضرورت سے زیادہ ہونے کا عذر فرمایا اور باوجود اصرار قبول نہ کی جب بھولِ رخصت وطن آئے کوہڑے تو شہنشاہ نے پہلے سے قاصد کے ذریعے عطائے جاگیر کا فرمان اس پیام کے ساتھ مکان بھیج دیا کہ مولانا کو سمجھا کر جاگیر لے لینے پر آمادہ کیا جائے۔ دو ایک روز بعد حبیب خود مولوی سید ابراہیم علی صاحب وطن پہنچے تو جادو منظم نے خوشی خوشی فرمان پیش کیا، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ دھلی کو واپس ہوئے تو اس کو

ایحتاج سے زیادہ معاش پسند نہ کی۔ دولتِ علم کو البتہ پشتِ ہاپشت سے ارثِ ابائی کا مرتبہ حاصل تھا اور بحمد اللہ ہے۔

پیدائش والد ماجد جناب مولوی سید کلب جعفر صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے ملازمتِ انگریزی اختیار فرمائی اور اس ذریعے سے دیوریا ضلع گورکھ پور میں قیام فرماتے تھے جب راقم کیم عدم سے منصفہ شہود پر آیا۔

استعدادِ شاعری بالکل اوائلِ ایام کے حالات تو نہیں، لیکن تقریباً چار برس کی عمر تک کے واقعات اکثر

۱۔ جدِ امجد جناب مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ، عمِ معظم جناب مولانا سید کلب عبد صاحب قبلہ اور ان کے فرزند برادرِ معظم جناب مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ، عمِ محترم جناب مولانا سید کلب باقر صاحب قبلہ اور ان کے فرزند اخِ الکرم جناب مولانا سید کلب ہمدی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہم میں سے اکثر ایسے بزرگ ہیں جن کے فضل و کمال کا سکہ ہند سے لے کر عراق تک رائج رہ چکا ہے اور بڑے جید علماء و مجتہدین میں شمار کئے جاتے تھے۔ آخر الذکر دونوں حضرات ہجرت فرما کر کربلا سے معلیٰ میں مقیم رہے اور وہیں کی خاکِ پاک میں مدفون ہوئے۔ اب بھی مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ المدعو بہ جناب کلب صاحب (دخلف الصدق فردوسِ مکان جناب مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ) اور مولانا سید عبد الہدی صاحب (مولانا سید محمد ہمدی صاحب) (فرزند ان جناب مولانا سید کلب باقر صاحب قبلہ قدس اللہ سرہ) اس عصر کے مجتہدین عظام اور علماء کرام کے نمونے

باب اول میں سید کلب حسین صاحب

یاد ہیں، یہاں صرف انہی باتوں کا ذکر کر دوں گا جن کا کسی نہ کسی طرح شاعری سے تعلق ہے۔

میرے بڑے بھائی جناب مولوی سید کلب جیہ صاحب کے دریا میں فارسی کی کچھ کتابیں تھیں، مجھے خوب یاد ہے کہ ان کے سبق کے جو اشارے میرے کانوں تک پہنچ جاتے وہ حافظے میں باقی رہتے تھے حالانکہ نہ صرف فارسی زبان سے میں اُس وقت بے بہرہ تھا بلکہ حرف شناس بھی نہ تھا۔ یوں ہی اگر کوئی شعر ناموزوں پڑھا جاتا تو سامعہ فوراً ناموزونی کو محسوس کر لیتا تھا حالانکہ عروض سے اُس زمانے میں مجھے کوئی واسطہ نہ تھا۔

تعلیم | بارے پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی گھر پر کچھ مذہبی کچھ درسی کتابیں پڑھ کر مدرسہ سرکاری میں داخل ہوا۔ تحصیل بانس گاؤں ضلع گوردیکھ پور اور پھر منصبہ جالس ضلع رائے بریلی کے مدارس اردو میں اتنے درجے طے ہو چکے تھے کہ کاسنگھ (ضلع ایٹہ) پہنچ کر بھی جہاں انگریزی مدرسہ موجود تھا، آخری جماعتوں کی تعلیم کے لئے اردو ہی کے مدرسے میں داخل ہونا پڑا۔ اردو کا ڈل پاس کیا۔ اب میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اس کے بعد کچھ انگریزی پڑھی۔ لیکن انٹرنس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

(نشا)

۴ غاز شاعری ہم سبق طلبہ یا مدرسین میں سے کوئی صاحب شعر و شاعری کا کچھ چرچا کرتے تو میں لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک روز کاسکینج کے مدرسہ اردو میں کسی صاحب نے ایک مصرع پڑھا ”آتے آتے طشت تک گوہر بنے اور ٹوٹ جائے“ اور فرمانے لگے کہ اس پر مصرع نہیں لگ سکتا۔ مجھے تعجب ہوا، ایک مصرع میں نے کہا اور ڈرتے ڈرتے سنایا:-

”اب نیاں کیا ہے، یاں ہر قطرہ میرا شکلا
آتے آتے طشت تک گوہر بنے اور ٹوٹ جائے“
سننے والوں نے حوصلہ افزائی کی، میں نے غزل کہہ ڈالی جس کا ایک ہی شعر اور یاد رہ گیا ہے:-

”میرے نالوں کا اثر ہے ورنہ کیا ممکن ہو یہ
غیر کا کوچے میں اُس کے گھر بنے اور ٹوٹ جائے“
گھر میں کبھی کبھی امام مظلوم حضرت سید الشہدا (علیہ آلاف التحیۃ والثناء) کی مجالس غرا ہوتی تھیں۔ میر انیس صاحب، میرزا دبیر صاحب اور دوسرے بزرگوں کا کلام از قسم رباعی و مخمس، میرثنیہ و سلام پڑھا جاتا تھا، میرے جی میں آیا کہ میر صاحب کے ایک سلام کو خمسہ کروں جس کا مطلب یہ ہے:-

(ح)

”مجرئی صدتے ہوں اس درگاہ پر
 فوق ہے جس کے گدا کو شاہ پر“
 ختمہ کیا اور لکھ لیا، مجلس ہوئی تو پڑھا، والد ماجد مدظلہ نے بھی سماعت فرمایا اور خوش ہوئے۔

کاسکینج میں کچھ شعرا بھی تھے، شاعر بھی ہوتے تھے، مشاعروں میں شرکت کی اجازت مجھے نہ تھی، لیکن مجھے اگر طرح معلوم ہو جاتی تو

لے یہ ختمہ نہ میرے پاس لکھا ہوا رہ گیا نہ مجھے یاد تھا، ایک بار محرم میں وطن جانا ہوا تو وہاں میرے بھانجے سید نجات علی سلمہ اللہ نے، جس کی عمر اس وقت چھ سال زیادہ تھی، مجلس میں سید نمبر کہا کہ میرا نیس صاحب کا سلام ہے، ناموں جان نے مصرعے فرمائے ہیں۔
 میں متعجب ہو کر ہنسنے لگا، انکے نے پڑھا تو یہ سلام تھا اور اس پر میری انھیں۔
 پھر اس کا تعریف کرنا مجھے بھی یاد آگیا، صورت یہ ہوئی تھی کہ میں نے مجلس میں پڑھنے کے بعد کہیں رکھ دیا اور بھول گیا، میری بہن مرحومہ کو ملا، انھوں نے حفاظت سے رکھ لیا۔
 برسوں بلکہ جگہوں کے بعد جب یہ کچھ مجلس میں پڑھنے کے قابل ہوا تو اسے تعلیم دی اور میرے علم میں لائے بغیر، میری موجودگی میں اچانک پڑھنے کی ہدایت کر دی۔ یہ محرم ۱۳۲۹ھ کا واقعہ ہے، آہ شہدائے حق میں وہ بہن نہ تھی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

میں غزل ضرور کہتا تھا۔

شاعری کا دوسرا دور | یہ زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ برس کی عمر تک کے واقعات ہیں، اس کے بعد بھی سلسلہ یوں ہی جاری

رہا۔ والد ماجد مظلہ کا تبادلہ ایٹم کو ہو گیا۔ ایٹم اور مارہرو (ضلع ایٹم) میں شاعر ہوتے تھے، کبھی کبھی خدائے بخشے میر مظفر حسین صاحب ایما کی سفارش سے مجھے بھی شرکت کا ایما ہو جاتا تھا۔ بہر حال فطرت تو متقاضی تھی ہی، حالات نے بھی کچھ اعانت کی۔ ستمبر ۱۹۱۹ء تک شاعری کی ہوا ایک خاص رخ چلتی رہی۔

شاعری کا تیسرا دور | آخر ایک روو داد نے حالات میں ایک تغیر عظیم پیدا کر دیا، ڈیڑھ ہی سال کی مدت اور

گزری تھی کہ سنی ۱۳۱۹ء میں رفیقہ حیات نے بیس سال کا ساتھ چھوڑا، دینا و ماہینا سے دل پھیکا ہو گیا، اس کے بعد شاعری میں جو تدریجی تغیرات رونما ہوتے رہے وہ مطالعہ کلام سے شاید اچھی طرح ظاہر ہو سکتے ہیں۔

ترکِ تعلیم و کتب بینی | شاعری اور شاعری کے معین حوادث کی بدولت پندرہ سولہ سال کی عمر سے درس و تدریس

کا شغل ایسا چھوٹا اور طبیعت ایسی اُچاٹ ہوئی کہ پھر کبھی کسی کتاب میں اچھی

لے شادی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔

(معا)

سے اچھی کتاب میں، دل نہ لگا۔ انتہایہ ہے کہ بہترین شعرا کے دیوان اور دلچسپ ترین افسانوں کا مطالعہ بھی ممکن نہیں کبھی اجاب خاص جو میری اور کتابوں کی ان بن سے خوب واقف ہیں، اگر کسی کتاب کے مطالعے کی بہت ہی سفارش کرتے ہیں تو دو چار صفحے سے زیادہ دیکھنے پر قدرت نہیں پاتا، اور پھر اس کتاب کے متعلق ان اجاب کے سوالات کا جواب اک ندامت آمیز تبسم کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

یہ صورت ہے ان کتابوں کی جن کا موضوع میرے ذوق فطری کے موافق کہا جاسکتا ہے۔ دوائے بر حال ان کے جو مدارس انگریزی کے مختلف درجوں کے لصاب میں داخل ہیں اور جن کا پڑھنا فرض کے طور پر طالب علم کے ذمے عائد ہوتا ہے چاہے وہ اس غریب کے لئے کیسی ہی غیر دلچسپ کیوں نہ ہوں۔ بہر نوع نتیجہ یہ ہوا کہ میری تعلیم ہر اعتبار سے نامکمل رہی اور گویا جاہل محض ہوں، نہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری نہ کوئی دستاویز فیصلت۔

معیشت | ثروت خاندانی کا حال پہلے ہی لکھ چکا ہوں، یوں میرے لئے معاش کا ذریعہ وہی پیش پا افتادہ مضمون ٹھہرا، یعنی ملازمت۔ کوئی بیس برس کی عمر سے نوکری شروع کی، تین برس ملیح آباد میں، اور تقریباً اتنے ہی دنوں پورنہ میں رہا، پھر تین سال بھر کا زمانہ گھر پر بیکاری میں بسر کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ریاست بھوپال کے ایک محکمے میں ہیڈ کلرک

مقرر ہوا اور زہے استقلال کہ نو سال تک اسی عہدے پر مامور رہا ۱۹۲۲ء
میں ریاست نے لیجلیٹو کونسل کا افتتاح کرنا چاہا اور دفتر میں بہ حیثیت نگراں
(آفس سپرنٹنڈنٹ) میرا تقرر عمل میں آیا۔ سال بھر کے بعد وہ محکمہ ایک دوسرے
محکمے میں مل گیا اور میری جگہ تخفیف میں آگئی۔

اب تو مجھے صدا و افعات ایسے یاد آتے ہیں کہ تقدیر نے میرے خلاف
مرضی جو صورت پیش کی اُس کا مال بہت خوش آئند تھا، لیکن یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء
کو دس سال کی مستقل ملازمت کے بعد جگہ کا تخفیف ہو جانا میرے لئے تردد و خیر
واقعہ تھا، خصوصاً اس سبب سے کہ میں ایک سال پہلے عقدِ ثانی کر چکا تھا۔
خیر، الحمد للہ بگروشت۔

تخفیف شدگان کے لئے جو احکام ریاست کے تھے، اُن کی تعظیم
اربابِ حل و عقد پر واجب سمجھتے ہوئے، میں کچھ دنوں اس کا متوقع رہا کہ
مجھے بھی کوئی مناسب جگہ مل جائے گی، لیکن یہ دیکھ کر کہ مقتدر حضرات،
حکومت کے ان احکام کو قطعاً پارہ نہ اور دفتر بے معنی سے زیادہ وقعت نہیں
دیتے، مایوسی ہوئی۔ زیادہ انتظار امکان میں نہ تھا، دسمبر ۱۹۲۳ء میں نیشن
کی درخواست دے کر جی بی ضیاء عباس صاحب ہاشمی بدایونی کی تحریک
سے گوالیار چلا آیا۔

حبیب موصوف کی محبت کا ذکر میں احسان کے نام سے نہیں کرنا چاہتا کہ

(۷)

یقیناً یہ عنوان بیان اُن کے خلوص و مودت کی توہین کا مرادف ہے۔ بہر حال سرکار گوالیار کی درس گاہِ صنعت و حرفت (کنکٹل انسٹی ٹیوٹ) میں ایک شعبے کی نگرانی پر مامور ہوا۔

تقریباً سال بھر کام کیا تھا کہ ریاست کی ایک مزدورت سے کلکتہ جانا پڑا۔ نصیر الممالک خان بہادر میرزا شجاعت علی بیگ کونسل جنرل ایران (موجودہ)

کلکتہ کا ایک سفر
اور مشاعرہ

کو میرے درود کی اطلاع ہوئی، اُنہوں نے اپنے یہاں شاعرے میں شرکت کی دعوت دی جو ۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو منعقد ہونے والا تھا۔ ۱۹ مارچ کو دعوت ملی، میں نے وعدہ کر لیا، شریک ہوا اور طرح کی غزل پڑھی جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے:-

”بجھے اے قیس اک جلوہ نظر آتا تو ہے دل میں
پھر اب کیا بحث، لیلۂ گھر میں بھی ہو کہ محل میں
مری ہر سانس گویا اک گامِ سحر ہے مانی

یہ میں جیتا نہیں، مصروف ہوں قطع منازل میں“
چونکہ میں اُس غریب نوازی کا ذکر واجب سمجھتا ہوں جس کے جلوے مجھے
اجابِ کلکتہ کے دامنِ اخلاق میں نظر آئے اور مضبوط دیا چہ لکھ ہی رہا ہوں اس لئے
اک ذرا تفصیل سے قیامِ کلکتہ کے حالات بیان کروں گا۔

مشاعر میں میری موجودگی کا علم خان بہادر نصیر الممالک اور ابو جعفر صاحب کشتی انسپکٹر مدارس کے سوا کسی کو نہ تھا۔ نہ مجھے کسی صاحب کی خدمت میں تعارف کی غرت حاصل تھی۔ ایک موقع پر کشتی صاحب نے میرے تخلص سے مجھے مخاطب فرمایا تو حکیم ناطق صاحب لکھنوی، آغا شاعر صاحب دھلوی، خان بہادر سید رضا علی صاحب دشت اور دوسرے شہر کا شاعر کو میری موجودگی معلوم ہوئی، پھر تو مشاعرے میں بھی بہت لطف رہا اور بعد مشاعرہ بھی بڑی دلچسپ صحبتیں رہیں۔ کبھی حکیم ناطق صاحب کے یہاں، کبھی دشت صاحب کے یہاں، کبھی نصیر الممالک مرحوم کے یہاں، کبھی اسلامیہ عربک کالج میں۔ غرض فرصت عطا اور روشنی طبع بلا ہو گئی۔ نواب نصیر حسین خان صاحب خیال نے بھی مدعو فرمایا لیکن میں معذور رہا کہ وقت نہ مل سکا۔

موجودہ ملازمت کی
شانِ نزول

اسی اٹار میں (۲۴ یا ۲۵ تاریخ پانچ کی ہوگی) اگرے سے حبیبی لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی کا خط ملا، جس میں انھوں نے بشورہ چٹاپ سید آل نبی صاحب مغفور بلدیہ اگرہ کی ٹکس سپرنٹنڈنٹی منظور کرنے کے لئے میرا استمراج کیا تھا۔ کھلتے میں ریاست کا جو کام تھا اُس سے بھی فرصت ہو چکی تھی، میں براہ اگرہ گوالیار کو واپس ہوا۔ اگرے میں سید صاحب مدوح (صدر بلدیہ) سے ملاقات ہوئی، مصر ہوئے کہ گوالیار جا کر جلد سے جلد اگرے

(ن)

واپس آؤں۔ لیکن کئی مہینوں تک اپنے کو تعمیل سے قاصر اور ان کے تقاضے کو جاری دیکھ کر، آخر میں نے معذوری ظاہر کی اور انکار کر دیا۔ پھر خط پہنچا کہ ”جب تک آؤ گے انتظار کیا جائے گا“ اب میں کفرانِ نعمت کی پاداش سے ڈرا، جلد کوشش کر کے، ۱۳ مئی ۱۹۲۵ء کو آگے پہنچا اور ۱۵ مئی ۱۹۲۵ء سے موجودہ عہدے کا کام شروع کر دیا۔ اس عہدے کے کاموں کی نوعیت اور کثرت، اور ان کے ہوتے ہوئے فکرِ سخن یا دوسرے ادبی مشاغل کی فرصت، بعد المشرقین کی نفسیر ہے۔

اتفاق سے کچھ دنوں بعد مجھے جناب فانی بدایونی وارواگرہ ہوئے، کبھی کبھی شعرِ سننے سنانے کا لطف رہنے لگا، خبری رسالہ تسنیم کی ادارت ۱۹۳۱ء میں رسالہ تسنیم جاری ہوا جس کی ادارت میں مجھے بھی فانی صاحب اور مخدوم صاحب کی شرکت کرنی پڑی۔ دسمبر ۱۹۳۱ء سے یہ دونوں حضرات تو دست کش ہو گئے اور قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔

ارباب ذوق اور اہل بصیرت کافی حوصلہ افزائی تسنیم کی فرما رہے ہیں اور تسنیم بھی دل کھول کر ادبی خدمات بجالا رہی ہے۔

یہ ہے میرا ماضی و حال مستقبل کا علم خدا کو ہے۔ بظاہر تو، دم واپس بس رہا ہے بس اب یار و استاد ہی اللہ ہے

عبد مذنب سید کلب احمد مانی۔ جاسی

{ آگرہ۔ جون ۱۹۳۲ء
مطابق، صفر ۱۳۵۱ھ

غزلوں کی فہرست

شمار	مطلع کا مصرع اولیٰ	صفحہ	تعداد اشعار
۱	لب ہلین شکر میجایں یہ دم بھی نہ رہا	۱۰	۷
۲	اللہ اللہ تیرے کھٹ بہرِ مہمانِ فراق	۱۵	۹
۳	خامشی اچھا ہے شیوہ پیکرِ تصویر کا	۱۷	۷
۴	خود نہانے خود کو جب وقتِ تماشا کر دیا	۲۵	۵
۵	بات ہی کیا ہے اک بلا نہ رہے	۲۷	۵
۶	درست اسے گریہ بھر آج دل ہلکا ہے پہلو میں	۲۷	۹
۷	اجازت دیجئے رونے کی اب تو دل کی حالت پر	۲۸	۹
۸	پڑا وہ پاؤں جس پر سر بھی میرا اُس زمیں پر تھا	۲۹	۷
۹	عشق تو سنا تھا جلوہ صاعقہ بار دیکھ کر	۳۸	۹
۱۰	اک قطر ہے عمر بھر کی کاہشِ دل کا عوض	۳۹	۵
۱۱	جھگڑا ہی چکا، میں بھی چلا دوڑ جگر بھی	۴۰	۵
۱۲	گلا کسے ہے اگر آپ دل نواز نہیں	۴۶	۵
۱۳	عیادت میں جو ہیں نیکی کے پہلو، اُن کو مت دیکھو	۴۷	۵
۱۴	جاؤ بالیں سے اُٹھو تو موت کو اُسے تو دو	۴۹	۵
۱۵	ثابت ہو دردِ افزا جب اُن کی دل نوازی	۵۱	۷
۱۶	میان سے اُن کی تیغِ ناز آہِ مکمل کے رہ گئی	۵۲	۵

غزلوں کی فہرست

شمار	مطلع کا مصرع اولیٰ	صفحہ	نمبر
۱۷	اشد آج بعد یک زندگی فرقت	۵۳	۹
۱۸	چلیں ماعل کو جب یہ شورہ میں نے کیا دل سے	۵۵	۵
۱۹	ہو کیوں نہ باریاب اجابت دعا کے شب	۵۵	۵
۲۰	یہ بند و بست بھی کچھ تو نے کر لیا صبا د	۵۶	۹
۲۱	کب کہا ہم نے کہ پہلو میں ہمارے دل نہیں	۵۷	۷
۲۲	پیش کر سکتے ہیں ہم گل کا گلستان کا جواب	۵۸	۵
۲۳	آج تو ظالم کی آنکھوں میں مروت ہی نہ تھی	۷۱	۷
۲۴	عشرت عہد گزشتہ کو بس اب یاد نہ کر	۷۳	۵
۲۵	تیری پوش سے سکوں ہوتا ہے اسے قاتل بہت	۷۳	۵
۲۶	بجا کہتے ہو تم بجا تھی جو دل کو شکایت تھی	۷۴	۷
۲۷	کس کے سہارے رہ، آہ امید وصال	۷۵	۵
۲۸	سخت جان ہوں دیکھئے حسرت یہ کیا بنتی ہے آج	۷۶	۵
۲۹	کسے خبر کہ ہوا ہوں کب اور کہاں برباد	۷۷	۵
۳۰	جینے سے یہ بیزاد مرا قلب خیز ہے	۷۸	۵
۳۱	جی میں آتا ہے کہ رو میں اپنی بربادی یہ ہم	۷۸	۵
۳۲	کیا کروں میں، ہو تو ہوا ان کو پریشانی بہت	۷۹	۵

غزلوں کی فہرست

شمار	مطلع کا مصرع اولیٰ	صفحہ	جلد
۳۳	ناحق اجاب مناق مرے بدنام رہے	۸۹	۷
۳۴	پتے بحث تو یہ کہ دل حریف بلائے الفت ہے یا نہیں ہے ..	۹۰	۷
۳۵	خس ہو تو مل جاتا ہے سب کچھ دار امکان میں	۹۱	۷
۳۶	جب کل مری تسلیم کا قصا نہ ہوا	۹۲	۷
۳۷	نہ قفس ہی نظر آتا ہے نہ میا د مجھے	۹۸	۵
۳۸	غم ہوا دل سے نہ جاناں کے ستم سے پیدا	۹۸	۷
۳۹	کسے دعوئے کہ جوش اشک غوئیں سیل دریا ہے	۱۰۰	۵
۴۰	تاصبح انتظار ہے اُن کا تو ہم نہیں	۱۰۱	۵
۴۱	پھر ایک دن تجھے اے برق مہماں تو کریں	۱۰۲	۹
۴۲	ہیں بخوبی آشنا رازِ حیات دل سے ہم	۱۰۵	۷
۴۳	وہ ہم پر یہ سمجھ کر اور بھی بیدا کرتے ہیں	۱۰۶	۷
۴۴	کب نفاں با اثر نہیں ہوتی	۱۰۷	۹
۴۵	سُنتے تھے کچھ تو کہتے تھے کچھ اپنے جی سے ہم	۱۰۸	۱۱
۴۶	وہ جلوہ گر ہیں پھر بھی ہے گلہ ہیں حجاب کا	۱۱۰	۴
۴۷	تجھے اے قیس اک جلوہ نظر آتا تو ہے دل میں	۱۱۰	۷
۴۸	دنیا کا غم دیا دلِ غم آشنا دیا	۱۱۲	۵

غزلوں کی فہرست

شمار	مطلع کا مصرع اسے	صفحہ	صفحہ نمبر
۴۹	نہ پوچھ اسے نوا سیراب مجھ سے آثار بہاراں کو ..	۱۱۲	۱۱
۵۰	شوق دیکھو خنجر قاتل جو عیاں ہو گیا ..	۱۱۴	۱۱
۵۱	سہل نہیں کہ ہوشیار خلوتیانِ راز میں ..	۱۱۵	۷
۵۲	وہ ابھی ڈرتے ہیں ذکرِ نالہ سنبکیر سے ..	۱۱۶	۷
۵۳	مقدر جہاں ایک دن مجھ کو لایا ..	۱۱۷	۲۰
۵۴	وہی وہ، وہی نرم، کیسے کہوں میں ..	۱۲۱	۱۱
۵۵	داد خواہی کا مجھے حشر میں کیا ہوش نہ تھا ..	۱۲۴	۵
۵۶	بجلی مضطرب کہ ٹوٹے کسی کا شانے پر ..	۱۲۵	۷
۵۷	خم ہے سر، شرم جفا ہے میری حالت دیکھ کر ..	۱۲۵	۷
۵۸	وہ بھی ہیں جنہیں عشق سے کچھ کام نہیں ہے ..	۱۲۶	۹
۵۹	غرلت یاس میں کہاں اب وہ جنوں زندگی ..	۱۲۷	۷
۶۰	ہوئی ہے چارہ سازی منحصر دیدارِ جاناں پر ..	۱۲۸	۷
۶۱	کی موت نے پیدا اک نسکین کی صورت کی ..	۱۲۹	۹
۶۲	وہ خود آج آمادہ امتحان ہے ..	۱۳۱	۹
۶۳	نہیں سنتے ہم نہ سنیں مگر، ہے صدا تو پردہ ساز میں ..	۱۳۲	۷
۶۴	قصد و تصور یعنی راہ طلب کے مبادی کچھ بھی نہیں ..	۱۳۳	۷

(دقیقہ نشانی)

(ت)

غزلوں کی فہرست

شمار	مطلع کا مصرع اوّل	صفحہ	شمار
۶۵	لایا ہے بام پر انھیں جذبہ جواب کا	۱۳۴	۵
۶۶	راگسنگاں ظلم ترا اسے ستم ایجا دہیں	۱۳۵	۷
۶۷	جادہ پیائے تناب بھی آجا ہوش میں	۱۳۵	۷
۶۸	آسمانوں میں تو چکر بر سبیلِ دام ہے	۱۳۷	۷
۶۹	مرادم تو میری آنکھوں میں نظر کا ہم نشین ہے	۱۳۷	۹
۷۰	نہ فقط یہ کہ میں اب درخور محفل نہ رہا	۱۳۹	۹
۷۱	دم واپس ہے آخر ترا انتظار کب تک	۱۴۲	۵
۷۲	اُن کا دن اُن کی رات ہے مانی	۱۴۳	۷
۷۳	ہوش کے امتحاں سے دل ہی نہ باز آئے کیوں	۱۴۴	۹
۷۴	دل کی فنا پر غم کی فنا کا مدار ہے	۱۴۵	۹
۷۵	بچائے رکھا ہے اے صبر آبر و میری	۱۴۶	۹
۷۶	سبزنگوں چار طرف گنبدِ مینائی ہے	۱۴۷	۹
۷۷	ہاں مری موت بھی اک نوبتِ حیرانی ہے	۱۴۹	۷
۷۸	جس کو تیرا ستم ٹانہ سکا	۱۵۰	۷
۷۹	سسی مشک و رہوئی آپ کے دیوانوں کی	۱۵۱	۵
۸۰	بے تکلف یاس پہنچاتی لب ساحل مجھے	۱۵۲	۷

(نقوش بانی)

(سرا)

غزلوں کی فہرست

نمبر شمار	صفحہ	مطلع کا مصرع اولے	شمار
۷	۱۵۳ درکش سلطنت ایاز می ہے ..	۸۱
۵	۱۵۴ در وہی در وہی دل اور دے ناشاد نہیں	۸۲
۱۱	۱۵۵ اندازہ ترا کیا ہے وہ کیا جانئے کیا دے ..	۸۳
۷	۱۵۶ ہائے وہ دل جسے اندوہ کا یا را بھی نہ ہو ..	۸۴
۹	۱۶۰ اے عشق مجھے ہوش سے بیگانہ بنا دے ..	۸۵
۷	۱۶۱ فتنے پہلے غم دل کی انتہا معلوم ..	۸۶
۷	۱۶۲ نال غم ہے غم امید تاثیر فغاں کیسی ..	۸۷
۹	۱۶۴ جو سانس ہے اک نزل عرفان و یقین ہے	۸۸
۹	۱۶۵ نغمہ یاس جو چھڑا شب تنہائی نے	۸۹

نظمیوں کی فہرست

نمبر شمار	صفحہ	عنوان	شمار
۲۵	۱ فلسفہ عشق ..	۱
۳۰	۵ کارنامہ حسن ..	۲
۹	۹ راز بقا ..	۳
۱۳	۱۱ سوگوار آرزو (مدس)	۴

(نقوش مانی)

(ش)

نظموں کی فہرست

شمار	عنوان	صفحہ	پہلا نمبر
۵	پیامِ بسیار	۱۸	۱۴
۶	مجبورِ محبت (مسدس)	۲۱	۱۰ بند
۷	سکلی	۲۳	۱۲
۸	سکونِ یاس	۲۶	۱۰
۹	حسن و عشق (مناظرہ)	۳۰	۹۸
۱۰	دیارِ دوست	۴۰	۱۸
۱۱	مہجورِ پیمپا	۴۳	۲۲
۱۲	ناشکیبائیِ معذور	۴۸	۱۰
۱۳	”ییا کہ عہدِ وفا نسیب استوار بیا“	۴۹	۱۴
۱۴	سرمایہ اور شبِ ہجر	۵۴	۱۲
۱۵	استغناء و نوید	۶۰	۱۸
۱۶	جہانِ غم	۶۶	۱۵
۱۷	کشِ کشِ امید	۷۱	۸
۱۸	فریبِ وفا	۸۰	۶۰
۱۹	آہِ نارسا (مسدس)	۸۵	۶ بند
۲۰	قوسِ قزح (مسدس)	۱۰۱	۵ بند

(لقوش مانی)

(ت)

نظموں کی فہرست

شمار	عنوان	صفحہ	تعداد
۲۱	غاکٹر شتعل	۱۲۰	۲۱
۲۲	رموز حقیقت	۱۵۸	۸۰

حسنوں کی فہرست

شمار	خمسہ کئے ہوئے کلام کا مصرع اولے امعہ نام مصنف	صفحہ	تعداد
۱	لے تازہ وارون بباہ ہوا سے دل .. (قطعہ حضرت غالب مخفور)	۱۶	۵
۲	بباہ عجریں تھا ایک دل یک قطرہ نوں بھی (غزل حضرت غالب مخفور)	۱۹	۷
۳	پیش سے میری وقت کش کش ہزار بستر ہی (")	۵۹	۶
۴	یہ نہ تھی ہماری تمّت کہ وصال یار ہوتا .. (")	۶۲	۱۱
۵	اکتہ جیں ہے غم دل اُس کو سنا سے نہ بنے (")	۶۸	۹
۶	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں .. (")	۸۷	۷
۷	نالہ جز حسن طلب اسے تم ایجا و نہیں .. (")	۹۴	۱۰

کلام متفرق کی فہرست

شمار	صنف کلام و تفصیل ضروری	صفحہ	تعداد
۱	قطعہ تاریخ و فائیت رفیقہ حیات	۹۳	۷
۲	چار بیت	۹۷	۱۱

بسمِ جانہ
۱۔ فلسفہ عشق

دسمبر ۱۹۱۲ء

ہو عشق اک سودائے سر، یا کاشش روح درواں
یا لذت در دجگر، یا حسرت آرام جاں
مجموعہ آلام ہے، سوزِ دلِ ناکام ہے
یا موت کا پیغام ہے، یا ہی بلائے جاں ستاں
اک نکتہ ہے اک راز ہے، رمزِ نیا زونا نہی
یا یہ کہوں اعجاز ہے، جو دل سے ہوتا ہی عیاں
یہ ناوکِ صیاد ہے، یہ نشترِ فساد ہے
یہ خنجرِ جلا دہے، یہ اک فنا کا ہے نشان

یہ باغ میں گل ریز ہے ، صحرا میں وحشت خیز ہی
 دل میں الم انگیز ہے ، سر میں جنوں کا راز داں
 آنکھوں میں ہے یہ اشکِ غوں ، سینے میں ہے سوزِ دروں
 ماتھے میں بختِ وارگوں ، ہونٹوں پہ آہوں کا دھواں
 نیکیوں میں فسرد ہے ، چہرے پہ رنگِ زرد ہی
 بریں دل پر درد ہے ، تن میں ہے جانِ ناتواں
 بے خوف ہی ، بے باک ہی ، بے رحم ہے سفاک ہی
 ایسا یہ اک فراق ہے ، ممکن نہیں جس سے اماں
 ایسا چشمِ پرچہنا ، خونِ شہیدانِ وفا
 آئینِ اربابِ صفا ، طرزِ مستم ہائے بتاں
 ہے بختِ جنوں ، فارس میں کوہِ بے ستوں
 لیے لے لے کی آنکھوں کا فوں ، شیریں کا حسن بے اماں
 یہ جہلِ جانا نہ ہے ، یہ دشمنِ بیگنا نہ ہے
 دل اس کا خلوت خانہ ہی ، یہ دل میں رہتا ہی نہاں

وہ دل جو ہے آئینہ اسرارِ پنہانِ دیاں
 وہ دل جو ہے گنجینہ رازِ وجودِ دو جہاں
 ہاں رہو راہِ فنا، ہاں کشتہ تیغِ وفا،
 ہاں میرے پیارے دل بتا، اس کی قیامتِ خیزیاں
 منظرِ بلا انگینہ وہ بھولانہ ہو گا تو ابھی
 یعنی ہو جب عشق آ کر آہ تیرا میماں
 ہنگامہ محشر تھا یا سماں درودِ عشق کا
 میری نظر میں پھر رہا ہے وہ تلاطمِ کاسماں
 دامنِ ادھر وحشت نے میرا پرزے پرزے کر دیا
 میں نے ادھر دامنِ صحرا کی اُڑا دیں دھجیاں
 کیسی قیامت کی تپش سینے میں پیدا ہو گئی
 کس درد سے دیوانہ ساں کی میں نے ردِ در و گرفتار
 میں اس طرف یوں مضطرب تھا اُس طرف نالے مرے
 ہوئے تھیں تک آپہنچے کہ مکلیں اور ہلا دیں آسماں

اُس وقت راہِ عشق سے میں بھی تھا ایک سرِ نابلد
 اور تیرا مافی الذہن بھی تھا مطلقاً مجھ سے نہاں
 اب عشق کے آثار سے کچھ میں بھی واقف ہو گیا
 تجھ کو جو ربطِ خاص اس سے ہو، ہوا وہ بھی عیاں
 میرے تو وہی سیلاب ہے اے غرقِ امواجِ بلا
 خون کی جگہ تیری رگوں میں جو ازل سے ہو رواں
 سمجھا میں اب اے میرے جلتے دل، یہ وہ سوزشِ ہو
 پتھر کے شعلے کی طرح، باطن میں تیرے تھی نہاں
 بیچ تو ہے عشق ایک ایسا دردِ لطف انگینہ ہو
 بے اس کے بالکل بیچ ہے، گر ہو حیاتِ جاوداں
 جس کو بنالے یہ اسیر اپنا، ہوا آزاد وہ
 ممکن نہیں پھر ہو کبھی قیدِ تیری غم ہائے جہاں
 رازِ طورِ انبیا، سرِ وجودِ قدسیاں،
 انمختصر ہے وجہِ تخلیقِ زمین و آسمان

۲۔ کارنامہ حسن

جون ۱۹۱۳ء

ہے فلک پر قدرتِ باری کے، یوں نورِ ثناءں اک ماہِ ہیں
کہ منور سہما سر جس سے، مخلوقِ خدا کے دل کی زمیں
کو راس کو یدِ بیضی سمجھا، بیمار اُسے عیسیٰ سمجھا
مجنوں نے اُسے لیلے سمجھا، فرہاد اُسے سمجھا شیریں
وامق نے اُسے عذرا سمجھا، ہاروت اُسے زہرہ سمجھا
موسے نے نہ جانے کیا سمجھا، غش ہو کے گرے ہر طور ہیں
جانا ہے کسی نے اُس کو صنم، سمجھا ہے کوئی قنیلِ حرم
برقِ خاطر کہتے ہیں ہم، جس کی ہیں تاب دیدہ نہیں
رندوں کے لئے ہے جامِ وسبو، آہو کے لئے سبزے کا نم
قرمی کے لئے سرِ وِ دل جو، بلبل کے لئے ہے گلِ رنگیں
اک جاگر پہ آبِ وفا، اک جاغورِ دلِ اہلِ صفا
اک جاتبعِ پر خونِ جفا، اک جاشکنِ بالائے جبین

کہیں زلفِ پری، کہیں ناگن ہے، کہیں چشمِ آہو پر فن ہے
 کہیں باغ میں لالہ و سوسن ہے، کہیں زینتِ دامنِ گل چیں
 کہیں نرگس چشمِ کہیں گل رو، کہیں غنچہ دہن کہیں سنبل مو
 کہیں شعبہ گر، کہیں عربہ جو، کہیں جو رلقا، کہیں باہ جہیں
 کہیں غازہ روکے زیبا ہے، کہیں روح و روانِ تنہا ہی
 کہیں راحتِ جانِ زلیخا ہے، کہیں ملکِ مصر میں تختِ نشیں
 کبھی محمودِ اہنائے زماں، کبھی نورِ دہ چاہ کغساں
 کبھی روشنیِ کنجِ زنداں، کبھی شمعِ ہدایتِ راہِ یفتیں
 کبھی مایہ ناز و تعلیٰ ہے، کبھی مضطربِ دل کی تسلیٰ ہے
 کبھی پرتو برقِ تجلیٰ ہے، کبھی جلوہ فروزِ عرشِ بریں
 کبھی صحرا گر دوں کا مہاں، کبھی زیبِ دہِ قصرِ سلطان
 کبھی شیرِ افکن کا بلائے جاں، کبھی تاجِ شاہ کا درِ نشیں،
 گمہ دامِ پیئے مرغِ دل ہے، گمہ مجوِ نظارہٴ بسمل ہے
 گمہ صیدِ فگن گمہ قاتل ہے، گمہ تیرِ قضا، گمہ خنجرِ کیں

گمہ باعث الفتِ واقع ہے، گمہ مقصدِ جذبِ صادق ہے
گمہ پیشِ قلبِ عاشق ہے، گمہ سوزِ دلِ شیدائے خریں

یہ مطلب ہر اہلِ دل ہے، یہ مرادِ سرِ و کابل ہے
زاہد بھی اسی پر مائل ہے، یعنی ہے طالبِ حور العین
یہ حُن، یہ اک روشن لوہے، نظارہٴ سوز و پرِ صنو ہے

مگر اس کا نور اک پر تو ہے، یعنی روشن بالذات نہیں
ہاں جس سے ہو روشن نام اسکا، جس سے ہو یہ شہرِ عالم اسکا

یوں جس سے بڑھا اکرام اس کا، وہ عشق ہے اور اُس کا آئیں
لے عشق اے ثابتِ زخندہ، اے جو ہر محض لے نورِ متیں

تو شمسِ نظامِ قدرت ہے، یہ حن اگر ہے ماہِ بسیں

تیرے فیض سے حُن کے جلوے ایسے کچھ مشہود ہوئے
آخر اس کو جو ہر سمجھے جہاں کے اکثر ظاہر ہیں

اربابِ دل واقف ہیں مگر، یہ حن عرض ہے تو جو ہر
آمانہ کسی کو حنِ نظر، گر تیری ضیا ہوتی نہ معین

اوصاف اپنے اے عشق نے، اب ایک شکایت بھی سن لے
 ایسی کہ جواب اس کا تجھ سے، ممکن ہی نہیں، ممکن ہی نہیں
 وہ حسن نوازی کی تو نے، وہ حسن کو غرت دی تو نے
 وہ شان اسے بخشی تو نے، وہ ناز ہے وہ جہاں ہیں
 کہ بنایہ بانی جو روحنا، اور موجب غمزدہ ناز و ادا،
 ہوا مستحق تسلیم و رضا، وہ اس کی سادگیاں نہ ہیں
 وہ طرزِ ستم اسے یاد ہوئے، کہ ہزاروں دل ناشاد ہوئے
 ارمان بہت برباد ہوئے، بہت آرزوئیں پامال ہوئیں
 آ۔ تجھ کو دکھاؤں ایک سماں، اک حال پراندہ و چراں
 عجب ایک قیامت کا سماں، واللہ عجب منظرِ غمیں
 وہ مریض جو بسترِ غم پر ہے، کیا دکھ بے چارے کے دم پر ہے
 حسرت کی نظر کبھی ہم پر ہے، کبھی سوئے فلک کبھی سوئے زمیں
 پڑے رونے اس کے نصیبوں کے، ہنصوں پر ہاتھ طبیبوں کے
 نالے ہیں لبوں پر غریبوں کے، یوں جمع غریزہ سر بالیں

ہیں بھینس ساقط، حال دگر، نہ دوا کا عمل، نہ دُعا کا اثر
 ہمان ہے دُنیا کا دم بھسرا، تر ہے عرقِ آخر سے جبیں
 جب یاس کا دریا چڑھتا ہے، حسرت کا تلاطم بڑھتا ہے
 یہ میسر کا مطلع پڑھتا ہے، باچشمِ پر آب صدائے خیریں
 اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا
 دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

۳۔ رازِ بقا

اکتوبر ۱۹۱۶ء

منظرِ دنیائے فانی ہو تا شاے سراب	اہلِ سنیش جانتے ہیں اس کے نطائے کو خواب
ڈوبتے ہیں اُت دن کتنے جہازِ زندگی	وقتِ غرق آیا ادھر ٹوٹی ادھر اُن کی طناب
موجِ بادِ فنا نے کر دیا برباد اُسے	بحرِ ہستی میں کوئی اُبھرا جو مانسہ جباب
کیا ہوا رشکِ ارسطو ہی جو کوئی عقل میں	کیا ہوا، اگر فلسفے میں ہو فلاطون کا جواب
کیا نتیجہ پھر، اگر کوئی ہو یوسفِ ساحیں	نفع کیا، اگر ہو کسی کو گنجِ قارونِ ستیاب
چاہے کوئی حسن میں کیا ہو یا دولت میں فرد	عقل میں تمثیل ہو یا فلسفے میں انتخاب

آہو کار ایک دن ہونا ہوا ان سب کو فنا ذرہ ذرہ جسم کا ہو جائے گا جزو تراب
 کب تک آنکھیں بند لے تانی زرا ہٹیا رہو دیکھ چشم دل سے دنیا کے فی کے انقلاب
 ”پر وہ داری می کس بد بربطان کرے عنکبوت
 چند نوبت می زند بر گنبد افراسیاب“

۴۔ غزل

جنوری ۱۲۹۱ھ

لب ہنس شکر میخا میں یہ دم بھی رہا ضعف یہ ہو کہ سر بار کرم بھی رہا
 چارہ سازی تو مناسب، مگر یاد ہے نہ رہا درد اگر دل میں تو دم بھی رہا
 سر بھر ہے، کلمہ برہنہ پائی کیوں ہو تاج اسکندر کو خیر و جسم بھی رہا
 ایک دل سوزنے پوچھا کہ ”نہیں تے آپ قطعہ شاید اب موجب زاری کوئی غم بھی رہا“
 میں نے کی عرض ”یہ سچ ہو نہیں سکتے آئندہ گداس سے نہ سمجھے کہ الم بھی نہ رہا
 گریہ کیا ہو، اثر جو شش خون دل ہو خون دل میں نہ رہا، آنکھ میں غم بھی رہا“

نہ سہی خیر سکونِ دلِ مافی کا خیال
سخت جانی، تجھے پاسِ شبِ غم بھی رہا
۵۔ سو گوارا رزو

مارچ ۱۹۱۶ء

مطمئن رہئے کہ اب جینا ممکن نہیں صوتِ تسکینِ جانِ مبتلا ممکن نہیں
آپ سے ایثارِ پیمانِ وفا ممکن نہیں چارہ سازیِ دلِ دروِ آشنا ممکن نہیں
اب مری صحتِ غم جاں کاہ کی تہید ہے
اُہ، اک حسرتِ زدہ کی موت اُس کی عید ہے
یوں ہی جیتے جی رہے گی مجھے ذوقِ نصیبِ زندگی میں خاک ہو سکتی ہے پھر راحتِ نصیب
تھا فرما جینے کا، موتی دید کی دولتِ نصیب کیا جیا، گریوں جیا بھی اُہ میں حسرتِ نصیب
میرے اراں گھٹ کے ظلمتِ خانہ دل میں ہے
شمعِ بزمِ افروز بن کر آپ محفل میں ہے
وائے حسرت، مگے سب سیرِ اربابِ عزیز لٹ گیا افسوس، امیدوں کا سامانِ عزیز
چل بسی دل سے تمنا جیسی ہمارا عزیز سوچے تو کیوں کھو بیٹھے گا وہ جانِ عزیز

دے گئی ہو آہ، جس کو رنج بے حد آرزو

جس کے سینے میں بپا ہو ماتم صبر آرزو

تھی غرض واللہ مجھ پر راحت دینا حرام کشکش ہائے الم میں نیست کٹتی تھی ہلام
یاس آخر دائمی آرام کا لانی پیام منتظر ہے موت اب ہوتا ہوں نصرت والسلام

بس خدا حافظ، چلانا کامکا بر زندگی

ہو مبارک آپ کو عیش بہار زندگی

دور ہو لے رنج ہجر، اے یاد ایام صال اے تنہاؤ نہ دو اب مجھ کو پیغام وصال

دل میں چھ جاتا ہوں شتر کی طرح نام صال صبح محشر کو سمجھ لو اب مری شام صال

کام اپنا کر لیا ہے زہر غم کے جام نے

اے تصور عیش کی صورت نہ آئے سامنے

کچھ نہیں تجھ کو بھی پایا بے اثر اے جذب عشت نزع میں آئے نہ وہ بالیں پر اے جذب عشت

میں اب کرتا ہوں مینا سے نغز اے جذب عشت ہو سکے تجھ سے تو اتنا کام کر اے جذب عشت

اُن کو دے آثر وہ عیش و سرور جاوداں

کھینچ دے اس بے کسی کی موت کا جاکر سماں

یہ خبر سن کر اگر شائد وہ ظاہر غم کریں یا زرا بخیرہ ہو کر اپنی آنکھیں نم کریں
 تو یہ کہنا آپ رنج مرگ مانی کم کریں آپ کے دشمن ہیں آزدہ یوں ماتم کریں
 آپ کو اللہ رکھے کا مگر آرزو
 کیا ہوا اگر مر گیا اک سو گوار آرزو

اب عبت ہو یہ تاسف ادیرہ ظہار غم جا چکا دار فنا سے آپ کا بیمار غم
 ایک جان نا تو اسے کیونکر اٹھتا بار غم موت کا پیغام تھا کم بخت یہ آزار غم
 تھک گئے تدبیر کرتے کرتے چارہ گر طلیب
 مرنے والے کو نہ لیکن ہو سکی صحت نصیب

زندگی بھریوں تو اس نے آہ دکھ پایا بہت ضبط غم کی سہی لالینی میں غم کھایا بہت
 حسرت دیدار نے آخر جو ٹپ پایا بہت میں نے دی تسکین یہ کہہ کہہ سمجھایا بہت

آزدہ یوں اگر ہیں دشمن جان فراق

اک نہ اک دن چاک رکھا ہو گریبان فراق

تھا مگر بد بخت کی تقدیر میں ٹٹنا لکھا کھیلتی تھی اس شکار موت کے سر پر قضا
 کیا کہوں بس تو چکی بد بختی کی انتہا میرا سمجھانا بھی بالکل بے اثر ثابت ہوا

اٹھ گیا دنیا سے وہ افسانہ غم زد گیا
 آہ لیکن مرتے مرتے آپ سے یہ کہہ گیا

”سے سروِ بجاں، مرادِ زندگی آپ کا دل مطلقاً ناقابلِ برداشت ہیں لاہم دل
 زہرِ غم سے ہو چکا لبرِ زینبی جامِ دل ایسی حالت میں اگر مرد جاؤں میں نا کام دل
 تو سمجھنا ایک جنس بے حقیقت کھو گئی

یا کوئی بلبل، گلِ عارض پہ صدقے ہو گئی
 واقعی میری حقیقت کیا ہو میرا کیا شمار میری جیسی لکھ جانیں تیرے قدموں پر شمار
 رہتی دنیا کتے کتے تجھ کو سلامت کر دوگا آئے باغِ زندگی میں کامرانی کی بہار
 عشقِ جبک دارِ دنیا میں ہو قدر افزائے حسن

تو رہے با صد غرور و نازِ ہم آراے حسن
 رنج کا ہے کا یہی ہوتا ہوا الفت کا مال ہو گیا ہو فرقتِ جاناں میں کتنوں کا وصال
 خیر میری موت تجھ کو خوشی ہو یا مال لیکن اک میری مصیبت ہے اُس کا خیال
 خیر سے اللہ بخشے جب تجھے تیری مراد
 دل سے میری مراد کی نہ بھولے تجھ کو یاد

اسے پہلے ہاں یہ کہنا تھا کہ اے جانِ جہاں تجھ کو گرانہ نہ ہو پندارِ حسن بے اماں
 میری میت پر چلے آنا بہ نازِ جاں ستاں ساتھ چل کر دیکھ لینا پھر یہ عبرتِ کساں
 بائیں پسلو میں مرے ہو گا مزارِ آرزو
 دفن ہوں گا اس طرح میں سو گوارِ آرزو

۶۔ غزل

مارچ ۱۹۱۷ء

اللہ اللہ یہ تکلف بہرِ مہمانِ فراق
 ہر زوئیں یوں لگ رہیں شمعِ جانِ فراق
 نالہ سناں کی شمعیں دماغِ گدگد کے پھول
 خونِ دل کہیں جس کی یاد میں سینچا لے
 کاش وہ بھی دیکھتا سیرِ خیابانِ فراق
 کاٹ دے مشکل مری تیغِ تمنائے وصال
 میں نہ لوں گالیں سر پر بارِ احسانِ فراق
 گوشِ دل سے سن شہیدانِ محبت کی صدا
 مبدیہ عمرِ ابد ہوتا ہو پایاں فراق
 بھیس آہوں کا بدل کر نکلی ہیں، آہیں نہیں
 حشر میں جاوے پیالے بیابانِ فراق
 جانے والے آہ ناتے پر ترے محلِ بندھا
 یا اسی محل کے پرے میں ہو ساں فراق

جی اُسی وصل پر آئی، خوشی ہے غم کے بعد
صبر کر مٹ جائے گایہ دور دوراں فراق

۷۔ تحمیں

(برقطہ حضرت غالب مغنور)

اپریل ۱۹۱۲ء

اے غافلانہ شیفتگانِ ادا کئے دل اے جاہلانہ معتقدانِ بقائے دل
اے جانِ ہنگامِ سیرِ نقشِ پائے دل اے تازہ دارِ دینِ ساطِ ہوائے دل
زہنِ را اگر تمھیں ہوسِ ناسے و نوش ہے

مانا کہ تاج و تخت سہی سلطنت سہی ہو اور بھی عدوئے خردِ عشرتِ شہی
یعنی وہاں تو اتنی سمجھ بھی نہیں ہے ساتی بجلوہ و دشمنِ ایمانِ آگہی
مطرب بہ نغمہ رہنِ تکیں و ہوش ہے

عبرت کی رویداد ہے اک مغلِ نشاط پردائے اور شمع کا باہم وہ اختلاط
دورے و دورِ گل و چویشِ انبساط یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط

دامان یا عباں دکن گل فروش ہے

ہر غرض کہ چھائی ہوئی تھیں مسرتیں وہ بزم تھی کہ نہاہ دو اعظ جو دیکھ لیں
بے اختیار بزم جناں سے شالیں یا صبح دم جو دیکھے آکر تو بزم میں
نہ وہ سرور و سورا نہ جوش و خروش ہے

وہ عیش مٹ گیا وہ مسرت فنا ہوئی گل ہے نہ لہ نہ ساقی و مطرب کی دل بڑی
ہاں یادگار عشرت بزم شبینہ کی داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے اسودہ بھی خاموش ہے

۸۔ غزل

اپریل ۱۹۱۲ء

خامشی اچھا ہی نہیں وہ پیکر تصویر کا یعنی کیا کہنا کسی کی شوخی تحریر کا
لطف کھو یا شکستے نظر رہے تحریر کا دیکھتا ہوں آنکھ سے کھٹا ہوا تقدیر کا
روفت بازار سودا اعتدال گیسو ترا زینت بزم جنوں حلقہ مری زنجیر کا
دست و حریت نہ بچتا دامن درشت جنہ آگیا ہے پیچ میں لیکن قدم زنجیر کا
اور سال تو نہیں اب قبر جنوں پر مگر نغمہ پرواز جنوں ہے غل مری زنجیر کا

کیا غضب ہے، کوہ کن کو حسرت شیریں ہی اور شیریں کو رہا ارمان جوئے شیر کا

بختِ وحشت آشنا کابل ہو لے مانی دہی

نفع کیا ہو میرے پاؤں میں ختمِ زنجیر کا

۹ پیغامِ بیمار

فروری ۱۹۱۵ء

برابر ہوتے ہیں ساعتِ بہ ساعشِ بغش طاری
جو کچھ فصلِ ایکیش سے دوسرے کو بو بھی جاتا ہو
زمانے بھر میں جس کا چارہ گر کر تو ہی ظالم ہو
کبھی انجام اُس خونیں جگر کا تو نے سوچا ہو؟
سمجھ کر اپنا پابندِ محبت یوں ستم کرنا
جو کھو بیٹھا ہو تیری یاد میں شش و خردِ ظالم
سلوکِ یسا کر لے جانِ جہاں بیمارِ الفت سے
یہ ظاہر ہو کہ جب تک سانسِ تکتِ اس باقی ہو
تعجب کیا کہ بیج ہی جاوے وہ دم توڑنے والا
گزرتی ہیں تیرے عاشقِ فیرت کی شبیں بھی
تو اتنی دیر تک ہوتا ہے مجھ گریہ و زاری
غضب ہے دے قسمت اُس مریضِ غم کی بیماری
اب اُنسو کی جگہ آنکھوں سے جس کی ہو جاری
یہ وہ طرزِ عمل ہو جس کو کہہ سکتے ہیں غمِ خوار
نہ رکھ اُس کے لئے جائزِ نفاق اور خود زاری
رہے بے چارہ تیرے مرے مجھ شکرِ دل ڈاری
بسا اوقاتِ محبت پائین سوں کے آزاری
پرستاری میں تیری کاٹ دے پھر زندگی ساری

زمانے میں ہے افسانہ تیری لُٹ اُڑی کا وفا کے ملک میں سکھ ہو تیرے نام کا جاری
 اگر مر بھی گیا، مر جائے، کہنے کو تو یہ ہو گا کہ تونے وہ کیا جو کچھ کہ تھا شاید لُٹ اُڑی
 کوئی ناداں اگر بالفرض ملزم بھی تجھے سمجھے تو بڑھ سکتی ہو تیرے واسطے کیا اس میں شہادی
 ہو اب بھی اُن جہاں اُفت تیرے طرزِ نفاست زمانے کی بان آج بھی لفظ ہیں جاری
 ”تیرے کوچے کو وہ بیارِ غم دار اُٹھا سمجھے
 اجل کو جو طیبِ اُدر موت کو اپنی دوا سمجھے“

۱۰۔ تَحْنِیس

(برغزل حضرت غالب مقفور)

فروری ۱۹۱۵ء

مٹی کی شے ازل میں ایک قسمت و اثر گونہ بھی اُسی زندگی والستہ، لیکن بے سکون ہ بھی
 جو کچھ سرمایہ عمر و روزہ تھا، اکھوں وہ بھی بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرِ غم وہ بھی
 سو رہتا ہو ہر اندازِ چکیدن سر گونہ بھی

مجتہد ہو بیگانہ تفسع سے، تکلف سے مگر جب غیر بھی پہننے لگے کچھ نے تکلف سے
میزان سے اپنے کو کیا ہم نے تکلف سے رہی آرزو ہم اس شخص سے چلنے تکلف سے

تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

اجل کے امرے پر ہم نے چاہا تھا کہ دل ٹھہرے ٹھہر جاتا، جو تھے صرف جیتے جی یہ صدمے
نہ ہو جب کے بھی امید آسائش تو پھر کہئے خیال مرگ کب تکین دل آرزوہ کو بخشے

مرے دام تمنا میں جو اک صید زبوں وہ بھی

نقا سے پیشتر بھی دل تڑپتا تھا اگر کم کم معاذ اللہ توبہ پیش کا ہو گیا عالم
کہ گویا اک جہان بے قراری دل پر غم نہ کرنا کاش نہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہدم

کہ ہو گا باعث افراش درد دروں وہ بھی

تغافل دل ستانی کا ہو کوئی راز؟ فرماؤ تکبر دل برہمی کا ہے کوئی انداز؟ فرماؤ
نہ یوں خون تمنا کے دل جاں باز فرماؤ نہ اتنا پرش تیغ جفا پر ناز فرماؤ

مے دریائے بے تابی میں اک معج خوں وہ بھی

طے آرام زیر چرخ کیا یہ حوصلہ کیجے امید کامیابی ہو تو عرض مدعا کیجے
تہی ظرف سے کیوں لے کار کوئی التجا کیجے مئے عشرت کی خواہش ساتی گردوں کی لک کیجے

لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں ہ بھی
 یہ بیچ ہی رہے ہیں عاشق کے دل میں قدم ادا
 کہ مانی کے بقول اُن کا بیانِ خارج از امکان
 مگر کس مجھ سے دو لفظوں میں شرحِ حسرت نہا
 مرے دل میں غالب شوقِ وصل مشکوہ بچا
 خدادادہ دن کرے جب اس سے میں بھی کہوں ہ بھی

۱۱۔ مجبورِ محبت

مئی ۱۹۱۷ء

شاق ہی جینا ہوا یہ کاش غم کا اثر
 تیرے قدموں کی قسم بارگاہِ تن پہر
 ہو تمنا کے سکونِ قلب مضطرب
 آرزوئے تواس سے بھی زیادہ ہے مگر

جیسے کہنے میں سے اس راحت جاں تو نہیں

یوں ہی دل پر بس نہیں ہو موت پر قابو نہیں

جب حالت ہو کہ تو مصروفِ جشنِ عید ہے
 اور جاں بربکِ یضِ اشتیاق دید ہے
 کون ہو بالیں پہ شمعِ مردہ اُمید ہے
 بے کسی ہی ظلمتِ اُمید ہی جاوید ہے

تو دل آرائی پہ آمادہ ہو، یہ ممکن نہیں

دل شکیبائی پہ آمادہ ہو، یہ ممکن نہیں

ابکوں ہو کس طرح، ظاہر معذوری می موت ہی باقی ہو جو حسرت کسے پوری می
 اہ، فیصل اور صحن باغ سے دور می قابلِ صدمہ ہو، انوس مجبوری می
 گل چمن میں ہیں چمن سیر کے دلِ ناشاد میں
 میں قفس میں ہوں قفس ہو قبضہ صیاد میں
 رحم کر لے تو، مجھ میں تابِ غم اصلا نہیں رحم کر لے موت مجھ سے دکھ سہا جاتا نہیں
 موت کیا تجھ کو کسی کے درد کی پروا نہیں موت کیا مشکل میں کلامِ آنا تراشیدوا نہیں
 تو ہی اک بلے ہی میری التجا کے واسطے
 موتِ ناامید مت کرنا خدا کے واسطے
 اہ، قیدِ زندگانی جس بلا کا نام ہے وہ بقولِ غالب اک ”بندِ غم“ و آلام ہے
 جیتے جی راحت کی یہ امید خام ہے تو اگر آغوش میں لے لوں آرام ہے
 ہے خدا شاہد کہ مجھ میں رنج کا یا رانہیں
 اب سو اس کے کہ مر جاؤں کوئی چار انہیں

لہ ”قیدِ حیات و بندِ غم“ اصل میں دونوں ایک ہیں۔“

تیری ٹیڑھی کو سمجھ کر درگاہ عیش و دام منظر ہوں صبح کے بتو اب بتی ہو شام
دل میں تیری یاد ہو، دردِ زبان تیرا نام آرزو میری پہنے پائے بے نیل مرام

ہے فقط تیرے کرم پر منحصر راحت مری

تیرے ہی دامن سے وابستہ ہوا جس تیر مری
آہ، پیار مئی، ت، اب تے دن بہت کم ہو گیا آفتاب اپنی شعاعیں لے کے مغرب کو چلا
ہو سہانا وقت، گلزارِ جہاں ہے پر نضا آج کی یہ شام ہو بس میری شام دعا
بعدِ مغرب آج مجھ کو بے کس و تنہا نہ چھوڑ

ہاں شبِ غم کے مظالم کے لئے جیتا نہ چھوڑ
جلد آ۔ شد، دن کی روشنی جانے لگی رات اپنے کاکل مشکیں کو بکھرانے لگی
ہاں، مے کہنے سے تو امی تو کیوں لے لگی ہائے تو بھی نازِ مشوقانہ فرمانے لگی
خونِ حسرت کر دیا، کیا کچھ کسی سے کم ہے تو

کیوں نہ ہو آخر تو ان کی تیغ کی ہمدم ہے تو

جوشِ دشت، اب فقط تیرا سہارا ہو مجھے مشعلِ صحرا نور دی گئی پیا رہا ہے مجھے
کب اسیری موسمِ گل میں گرا ہو مجھے آوازِ دھریہ رُوحِ محبوں کا اشارا ہے مجھے

رخصت لے زنداں جنوں نے بخیر در کھڑ کاٹے ہو
 فرد و خار و دشت پھر ملو امرا کھجلاٹے ہو
 ہاتھ اٹھ جاتا ہو رو رہ کر گریباں کی طر و حشمت دل کہہ رہی ہو چل بیاباں کی طر
 پاؤں لیکن بڑے پہلوئے جاناں کی طر بے قرار ہی کھینچتی ہو راحت جاں کی طر
 مخمضہ میں دل پڑا ہے کش کش میں جان ہو
 آہ اب مانی ہے داد یہ جاں گزاسا مان ہو

۱۲۔ کلی

جولائی ۱۹۱۵ء

زبان حال سے یوں کہہ رہی تھی ایک کلی
 میں نقش زیب و صفحہ بہاری ہوں
 میں جان گلشنِ روحِ رواں گلشن ہوں
 تمام اہل نظر اہل دل کی پیاری ہوں
 میں جن جہان میں فنا نہ ساز رنگِ چین
 میں صحنِ باغ میں رازِ شکوہ کا رہی ہوں
 اسی کے ساتھ تھی ایک صدائے خریں
 تو مستِ سخن ہی میں صرف مقرر رہی ہوں

تجھے تو مجھ سے تغافل ہو، اور استغنا
 میں مستند ہوا اے دل نگاری ہوں
 اگر تو ناز سے آمادہ جاں ستانی پر
 تو میں بہ شوق مہیا جاں سپاری ہوں
 تو خیر سے متبسم عروجِ بخت پہ ہے
 میں سرنگونی قسمت پہ صخر زاری ہوں
 میں جانتا ہوں کہ بلبل ہو یعنی وہ مخلوق
 کہ اپنی ذاتِ خود اپنی وجہ خواری ہوں
 اگرچہ دل سے ہو مجھ کو، پھر بھی یہ گناہ
 ہو تیری دُصن ہمہ تن شوقِ جاں نشانی ہوں
 ملا ہو مدتوں میں وقتِ عرضِ حالتِ دل
 مگر تو چپ میں سراپا ایسا داری ہوں
 غورِ حسنِ ادھر مانعِ کلام، سب تجھے،
 ادھر میں وقتِ صدا ندوہ بے قراری ہوں

جواب صاف نہیں خیر اے کلی نہ سہی
 اشاروں ہی میں یہ کہہ دے کہیں تمہاری ہوں

۱۳- غزل

جولائی ۱۹۱۵ء

خود مانے خود کو جبِ وقتِ تماشا کر دیا
 میں نے دامنِ نظر سے رخ کا پردہ کر دیا
 میں نہیں سمجھا، خدا کے واسطے سمجھائیے
 آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا کہہ دیا کیا کر دیا
 میری بے ثباتی، تمہارا غیر معمولی حجاب
 مجھ کو بھی، تم کو بھی، ان دونوں نے روا کر دیا

خسری، اور داد و بخشری، علام الغیوب تم چھپاؤ قتل اب میں نے تو دعویٰ کر دیا

آہ مانی، آج میں نے دید کا ارمان بھی

خیر سے نذر سلوک یا س افسز کر دیا

۱۴- سکون یا س

ستمبر ۱۹۱۵ء

بیکار ہے اب شکوہ تقدیر ربوں کام
بے فائدہ ہے اب گلہ گردشِ ایام
رایتیں بھی بہت دیکھ چکے عمر میں نہ بھی
تکلیف بہت پائی، اٹھایا بہت آرام
نہ راحتِ ماضی سے ہو اب ملے لہذا
نہ باعثِ اندیشہ گزشتے ہو کام
جو کچھ بھی ہوا تجربہ حاصل، وہ فقط یہ
تسکین نہ کہیں ہوگی نصیبِ ناکام
کیا شے ہو سکوں، یہ نہیں معلوم، مگر ہاں
عقلا کی طرح یہ بھی زمانے میں اک نام
جنگ ہو ذرا بھی جھلکِ امید کی باقی
اُس وقت تک امید سکوں ہو طمع خام
لو چھوڑ دیا میں نے اس امید کا دامن
اب کوئی تغیر ہو، نہیں میں تاثر
باقی ہی نہیں مجھ میں جس شادیٰ آلام
جسٹان چکا میں کہ نہ ٹھہرے گا کبھی دل
یکساں ہو مجھے دن ہو کہ شب صبح ہو شام

نومیدی ماگردش ایام ندارد
روزے کہ شبیہ سحر و شام ندارد

۱۵- غزل

جنوری ۱۹۱۶ء

بات ہی کیا ہی، اک بلانہ ہے نہ رہے جانِ مبتلا نہ رہے
آگ سیلے میں ہو گوارا ہے دل محروم مدعا نہ رہے
نہیں آلودہ ہو نہ دامنِ گل ہاں، مری خاکِ یاصبا نہ رہے
قفسِ زر نہ چاہئے یا رب میرا تنکوں کا آشیانہ رہے
دیکھیں مانی آشیاں برباد اب چین میں رہے بھی یا نہ رہے

۱۶- غزل

پانچ ۱۹۱۶ء

دست آگریہ ہجر آج دل ہکا ہی پہلو میں مگر کچھ پارہ ہا دل بھی تھے مخلوط آنسو میں

شمولِ خونِ لہو گیا گلِ رنگ یا شائد تمہارے رنگِ راضِ کلا اثر ہو میرے آنسو میں
 کسی کی آنکھ سے افسانہ غم پر جو نکلا ہو جزائے صدیہِ آرام ہو اس ایک آنسو میں
 اثر دلِ درجوان کی نگاہِ اولیں میں تھا الٹی منتقل ہو جا اب وہ میرے آنسو میں
 میں سوزِ ہجر سے آتشِ بجان ہو کبھی اضمی ہو کہ اک نسبت ہو میرے حال میں اور آپ کی میں
 وہ ہو آج آئیاں برباد جو گلِ ناز کرتا تھا کہ ہو میرے نشیمن شاخِ گل پر گل کے پہلو میں
 نہیں، فرصت ہو گی کش کش ہائے تمنائے مگر حجبِ چاہتا ہو یہ کہ تم ہو میرے قابو میں
 میں رہتا ہوں خدا کے اسطے تیور نہ بدلو تم نظر آتی ہو منجِ خونِ ارمانِ چین ابرو میں

پتہ معلوم، لیکن دستِ دشوار لے مانی
 ہے سامانِ کشورِ عقدہ دل عقدہ گیسویں

۱۔ غزل

اگست ۱۹۱۶ء

اجازت دیجئے رونے کی تب دل کی حالت پہ بہت اچھا میں آمادہ ہوا ترکِ محبت پر
 زبانیں تیز ہیں سب کی نصیحت پر ملامت پہ کبھی رونے کو بھی آیا کوئی دل کی مصیبت پہ
 سمجھ لیتے تو صبر آتا منزلے جرمِ الفت پر نہیں سمجھ لے غم اس لئے روتے ہیں قسمت پر

کسی کی رائے میں تو سراپا عیبت تھا، لیکن
 امید افزا کوئی صورت، نہ تسکین کا کوئی پہلو
 نہیں ہے باز پرسِ آخرت کے کوئی مستثنیٰ
 دیا پہلے ہی اربابِ محسوس کے کچھ فریب لیا
 مے اجاب میرا حال کہہ دیتے ہیں کچھ حاکم
 میں اُسے مل کے ہوتا ہوں نخلِ اُن کی ہڈیا پر
 آنکھیں اب اعتبار آتا نہیں اہلِ محبت پر
 غلط کیا ہے اگر حسیا ہوں امیدِ قیامت پر
 نقص کا بڑا الزام تھا مجبورِ الفت پر

وہ نقشِ سادگی ہو دل پہ آئی کہ ہوا اب تک
 تلافیِ ستم کا اعتبار اک بے مروت پر

۱۸۔ غزل

نومبر ۱۹۱۶ء

پڑا وہ پاؤں جس پر سر بھی میرا اُس میں تھا
 میں نے کب کہا تھا، آپ کے ابرو نہیں قاتل
 عرقِ شرم جھاسے اُن کی پیشانی پہ کب آیا
 گلے پہ جا بھی کر تا ہوں کہ اُس جلو کا شایق ہوں
 کبھی پہلے نہ تھا مہذول مجھ پر التفات اُن کا
 مگر یہ منحصر میری نگاہ واپس پر تھا
 وہی نقشِ قدم گویا مری لوحِ جبیں پر تھا
 مجھے کچھ شک اگر تھا بھی تو دستِ نازین پر تھا
 پینہ موت کا، افسوس، جب میری جبیں پر تھا
 ندامتِ جو کہ اُن آپ کی روئے حسین پر تھا
 مگر یہ منحصر میری نگاہ واپس پر تھا

زمانِ ہجر ہی، جب مے تابی سے کیا ڈرنا یہی الزامِ عہدِ وصل میں تھا، اور یہیں کچھ تھا

نہ ہو یہ ننتی تحریکِ ترکِ بت پرستی پر

دلِ آسانی میں یہ خطرہِ نزاعِ کفر و دین پر تھا

۱۹۔ حسن و عشق

(مناظرہ)

دسمبر ۱۹۱۶ء

عالمِ اسباب میں جب غم و عشق ہے	دارِ امکان جب مہنی بر وجود عشق ہے
شعلہٴ الفت کا جب رئے گل گوں ہو لقب	زلفِ جب نامِ پیچ و تاب و عشق ہے
جب اہلِ حسن کی گردن پہ ہوا صانعِ عشق	خُج کے پکیر میں جب جلوہ گر ہے جانِ عشق
دیکھتے آئے ہر کتب اہلِ بنشِ متصل	بارگاہِ عشق میں چمک رہی ہر شانِ عشق
یعنی جب کی حُسن پر پاکیں بزمِ شباب	اور ہوا عشقِ المِ خوافِ آقا با رباب
انگسار و عجز پر دیکھا ہے پھر کبر و غرور	التجادوں پر سنے ہیں بے نیازانہ جواب
رات کا قصبہ ہو، دیکھا میں اک منظرِ عجیب	بزمِ میں اک سمتِ صدر آرا تھا اک عشرتِ لب
سنا ساقی و مطرب شمع و گل، جام و سہو	اور تھا پائینِ بزمِ اک بے نوا، بے کسِ غریب

کفر کو جس طرح دی جاتی ہو نسبت دین سے بے اصولی کو مناسب ہے آئین سے
 ہوتا ہو اول کو آخر سے علاقہ جس طرح صدر کو بھی اک تعلق خاص ہے پائین سے
 صدر بزم ناز کیا تھا، ایک نام حُن تھا جلوہ گر جس بام پر قائم مقام حُن تھا
 بزم کی پائین میں تھا ماسن، اولے عشق سر بزاؤ جس جگہ شیدائے نام حُن تھا
 تھی وہ محفل جس کا ہر گوشہ تجلی بیز تھا ذرہ ذرہ فرحت افزا تھا، انشاط انگیز تھا
 گواہ صراحت لگ رہی تھی کہ لبون آہ تھی اس طرف لیکن معنی یوں ترنم ریز تھا
 ”شب کہ برق سوز دل سے زہرہ ابراب تھا شعلہ جوالہ ہر اک حلقہ گرداب تھا
 جلوہ گل نے کیا تھا داں چراغِ آفتاب یاں داں مرگانِ چشم تر سے رخِ ناب تھا“
 عشق جو بیٹھا ہوا تھا ایک کونینِ حال چونک ٹھانستے ہی یہ پیارا نقابِ حال
 آسمان کو دیکھ کر نالہ فلک فرسا کیا حُن پر ڈالی نظر پھر ہو گیا محو خیال
 عشق کا نالہ بہت دل دوز پر تاثیر تھا یا یہ کہئے شعر غالب تھا، کلام میر تھا
 حُن کا قلب جس طرف بے ساختہ کھینچے لگا نالہ کیا، دل کی کشش کے واسطے زنجیر تھا

حُسن نے آخر بلایا اُس کو اپنے روبرو اور یوں پوچھا، تبالے دل جلے ہو کون تو؟
 عشق نے دل تھام کر کی عرض با چشمِ آبِ میرا بندہ ہوں، ترا شہد ہوں میں لے شعلہ خور
 برق سننا تھا کہ چہرے پر مسرت چھا گئی دل کشی کچھ بڑھ گئی، کچھ اور رونق آ گئی
 جھک گئیں آنکھیں مگر جیسے جھکنے کے اُنھیں شان و سپاہ ہوئی، ہزل کو جوڑ پانگسی
 میں نہیں اُفت، مگر کہتے ہیں دانیانِ از آنکھوں ہی آنکھوں میں جوتے تھے ہم ناز و نیاز
 یا بظاہر چھارہا تھا بے خودی کا جو سماں دیکھے تھے شام اُس سے نغمہ لائے سوز و ساز
 خامشی یوں ہی غرض کچھ دیر تولی رہی حُسن نازک لبوں کو آخر شبنمِ جنبش ہوئی
 مُسکرا کر دین کیا اربابِ محفل سے خطاب ”اللہ اللہ دیکھے تو شوخِ چشمی آپ کی“
 عشق سے پھر دیں کہا ”اللہ یہ جرات تھے میرا شہد کیوں آخر مجھ سے کیا بابت تھے
 بے اجازت، بے طلب کیوں گیا تو بزم میں کھینچ لائی ہے، یہاں شاید تری شامت تھے
 کیا نہ تھا معلوم تھے کہ یہ کہہ سے دربارِ حُسن جلوہ گر ہیں بزم کے پرے میں یاں سراپا حُسن
 حاجبِ گاہ رہتے ہیں سلاطینِ سرِ بکعت واجبِ تعظیم کے بے ادب سرکارِ حُسن
 حُسن کی وہ شان ہے جس کا نمایندا ہوں میں حُسن کا وہ تختِ جن تکنت فرما ہوں میں
 تو بھی اُفت ہوگا، عالم پر تو روشن ہو یہ از یعنی ہر اہل نظر کی آنکھ کا تارا ہوں میں

مرکز صد لغتہ اسید ساز ہے — دل نواز اہل باطن میرا ہر انداز ہے
 ہر ادا میری ہے برقِ خمین صبر و قرار — فلاح ملک محل میری تیغِ ناز ہے
 حکم تھا میرا جو کس فرما دے جاں بازیاد — میرے ایک تھیں مجھوں کی جنوں پر دازیاد
 پوچھ لے جا کر زینچا سے زنانِ مصر سے — کیسی حیرت خیز تھیں میری کرشمہ سازیاد
 اکبرِ عظم کا وہ فرزند شہزادہ سلیم — میری شمشیر ادا نے دل کیا جس کا دو نیم
 گواہ سے ہندوستان کا تخت شاہی مل گیا — چین لیکن تب ملا جب میں ہوا اُس کا نیم
 مجھ کو کتا ہے جہاں عالم سپاہ آرزو — میری ہنرم ناز ہے آماج گاہ آرزو
 مقصدِ اہلِ تنہا جلوہ آرائی مری — میرے عارض کی ضیا نورِ نگاہ آرزو
 عشق بولا، گو مجھے آتی نہیں لافِ گزاف — لیکن اب میری زبان کھلتی ہے گستاخی معاف
 اپنے قدموں میں مجھے رہنے دیا ہوتا خوش — اور چھٹا ہوا توں اے حسن مجھ سے صاف
 تویہ کہتا ہے، مجھے تجھ سے کوئی نسبت نہیں — یہ وہ دعویٰ ہے، زرا بھی جس کی صلیبت نہیں
 یاد رکھ، والہ تہ میرے دم سے ہے تیری نمود — ورنہ تیری خود نمائی موجبِ شہرت نہیں
 بے طلب آنا مرا تجھ پر گراں گزرا اگر، — میں اب کے ساتھ خواہاںِ معافی ہوں مگر
 میں ہوں تو پھر کسے تسلیم ہو تیرا وجود — تیرا جلوہ چاہتا ہے یہ کہ ہو میری نظر

واجب التعلیم ہو لاریب تیری بارگاہ
 ہو مجھے بھی پاس غلط مرتبت خالق گواہ
 آؤ، لیکن تو نے مجھ کو بے ادب ٹھہرا دیا
 اک نہ را انصاف کہ کفرانِ نعمت ہو گناہ
 تو نایندہ ہو شانِ حسن کا بے اشتباہ
 تجھ سے زینبِ بنتِ خُتِ حن، اسی تختِ پناہ
 سب مجھے تسلیم، لیکن یہ خبر بھی ہے تجھے،
 حُسن کیا ہو، ایک جلوہ، میرا منونِ بگاہ
 ہاں سچ ہے دیکھنے والوں میں تیرے شہیر
 تجھ کو اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے ہیں، مگر
 اس کا باعث ہو فقط احوں، میری روشنی
 میری ماتحت ضیا ہو ایسے لوگوں کی نظر
 نغمہ امیدِ مملو جس سے تیرا ساز ہے
 کچھ نہیں ہو، میری پیدا کی ہوئی آواز ہے
 مجھ سے سن ہو ایک نالے تابعِ فرما
 دلِ وہل جس پر زارش کر کے تجھ کو ناز ہے
 ماننا ہوں میں کہ تو ہو دشمنِ صبرِ قرار
 اور تسلیم درضا پر میری فطرت کا مدار
 اچھے درگزر دارِ فخرِ تست آنِ ننگِ من است
 ہو مبارک تجھ کو یہ دعوائے، یہ ناز و افتخار
 وہ زنانِ مصر ہوں یا بے نوا فر باد ہو
 ہاں لیجا ہو کہ قیسِ خانماں برباد ہو
 سب مرے پر تھے غافل در نہ تیرا کیا اثر
 اس بشہ پر جو مری تقلید سے آزاد ہو

لے اصل مصرع حضرت غالب مغفور نے یوں فرمایا ہو "اچھے درگفتارِ فخرِ تست آنِ ننگِ من است"

فرض کر لے تو کہ ہاں، تیرا ہی سہل تھا سلیم میں نہ رکھا اگر اسے راہ طلب میں مستقیم
 کیسے بن جاتی تری مہر النسا نور جہاں، کیسے ہو جاتی وہ ناز ہند کا درِ یتیم
 مان لیں تجھ کو اگر اے حسن، شاہِ آرزو آسانے کو ترے سمجھیں پہاڑِ آرزو
 پھر بھی مجھ میں اور تجھ میں فرق رہتا ہی بہت میں ہوں غلابِ تنہا، میں الہِ آرزو
 سن لیا اے حسن نے اپنی باتوں کا جواب چپے ہوں اب میں اگر تو ہو گیا ہوا جواب
 در نہ کہنے کو تو میرے دل میں باقی ہیں ابھی ایسے کچھ نکلتے کہ جن کا ہو نہیں سکتا جواب
 اس نے فرمایا کہ ہاں، عشق بہتر ہے سنا رہ نہ جائے تاکہ تیرے دل میں کوئی حوصلا
 عشق نے یس کے پہلے حسن کو دکھا بہ غور پھر نہایت جلد کے عالم میں یوں کہنے لگا
 ”سن تو جہ سے کہ میں کیا ہوں، تر اتر رہا ہوں کیا تو عرض ہو، میں ہوں جو ہر س ہو تو، میں کیا
 مستقل میں، عاضیٰ تو ہیں حقیقت، تو مجاز جسم تو ہو، روح میں، ہتھ کو فنا، مجھ کو لغت
 ایسا گلشن کہ ازل سے تر آباد نیست عند لیبے کو کہ صرف نالہ و فریاد نیست
 شورِ بلبل کم نہ گرد، اگر رو دگل از چمن حسن بے بنیاد باشد، عشق بے بنیاد نیست

حریف دینے سنا ان عشق کی باتوں کو جب
 زلفیں بل کھانے لگیں، غصے میں لپکنے لگا
 کیا جہاں میں منظر آیات قدرت میں نہیں
 صورتِ اختر میں کیا تو نے نہیں دکھایا مجھے
 سوچ اے نادان تیرے دل کی احتیاج کون
 میرا منہ تو نے اپنے کو کہا تھا یا نہیں
 بسکہ لاسکتا تھا تاب نگاہ پر سنوں،
 آج کا راس نے پائے حسن پر سر رکھ دیا
 حسن کی جانب سے ہوتے سوالیہ پُراں
 امتثال امر کو پاس ادب پر فوق ہے
 ہاں تہ بندہ ہوں میں، ان تیرا عجب حال
 اپنی غرت کی قسم ہے تجھ کو یہ مجھ سے پوچھ
 علم کامل کو نہیں اس کو ہارسی ذات کا
 اس کی معلومات شاہ بھی دے موجود ہیں
 چاند سا منہ تمہارا اٹھا، بڑھا غیظ و غضب
 بس خموش امی عشق بس، ملحوظ رکھ حد ادب
 جو کہ پیکر میں نہایت بخشِ جنت میں نہیں
 جائے پیغمبری میں حق کی رحمت میں نہیں
 ہو تری تسکین کا باعث، و صورت کون ہے
 تو ہی بات بھی بتا شایانِ غرت کون ہے
 عشق تھا لڑائی خائف، اشکِ نیرِ نگوں
 چھٹ گیا ہاتھوں سے یعنی دامنِ صبر سکوں
 عشق بالکل دم بخود تھا غرقِ بحرِ انفصال
 یہ خیال آیا تو فوراً یوں ہوا صرفِ مقال
 رہ گیا اے حسن تر جج و تفوق کا سوال
 بلکہ مانی کو حکم گرداں بسبب انفصال
 پھر غنیمت ہو کہ ہو فی الجملہ ہم سے آشنا
 یعنی تیرا کارنامہ اور میرا فلسفہ

اور حسن کا راس نے پائے حسن پر سر رکھ دیا
 حسن کی جانب سے ہوتے سوالیہ پُراں

جلوہ گاہِ ناز میں مانی ہوا آخر طلب
 جب دلائلِ حسن کے بھی عشق کے بھی سن لئے
 اپنے اپنے رنگ میں تعجبِ لاجواب کے حسنِ عشق
 ہم خلا گشتی کی گئی، کوئی خوش ہو یا خفا،
 عشق کی ہستی حقیقت میں بقائے حسن ہے
 پر تو غورِ شید سے روشن ہے جیسے طہاب
 حسنِ جن کو اہلِ ظاہر کہتے ہیں نازِ آفریں
 اٹھ گیا دامنِ کُشاں ظالمِ عدالتِ گاہ سے
 روح تو وقتِ نظر آنکھوں میں آئی بے قرار
 داستانِ عشق طوفانی ہے قصہ مختصر
 اولِ اولِ شرحِ بالتفصیل دادِ افسانہ را
 جاںِ زلفِ ظاہرِ خوابِ ناز و نازِ اندازِ پیش
 بیٹھے اہلِ بزمِ سب کر کے ناز کے ادب
 فیصلہ اپنا سنایا اس طرح مانی نے تب
 صندوقِ عالمِ ہر دونوں کی جناب کے حسنِ عشق
 دونوں تو ہم ہاتھ اب آفتاب کے حسنِ عشق
 عشق کا طرزِ عملِ غرتِ فرائے حسن ہے
 عشق یونہی باعثِ نور و ضیاءِ حسن ہے
 ناموافقِ فیصلہ سن کر ہوا چیں بہرِ چیں
 عشق چنچ اٹھا کہ قربانِ دل کے دل نشیں
 آہ، اب کیا ہو کہ ہو پیاری داؤں پر تیار
 دیر تک کس یونہی بکھرا رہا دیوانہ وار
 آخرِ آخرِ سازِ کردارِیں نقشِ مستانہ را
 ماہِ بوسےِ مستِ ساقی پر دہ پیانہ را

۳۸ ۲۰۔ غزل

جنوری ۱۹۱۶ء

غش تو سنا تھا جلوہ صاعقہ بار دیکھ کر
مجھ کو گریہ کیا ہوا روئے نگار دیکھ کر
تنگ ہے وسعتِ فضا تجھ کو تو بیٹھ جا کہیں
دامنِ یار کو گزشتِ غبار دیکھ کر
کیا کموں اپنی سرگزشت میں چمن میں لایا
اور قفس میں جان دی، روئے بہار دیکھ کر
میں بھی ہی، جہاں ہی، گردشِ آسماں دہی،
پھر یہ نیا سا جوش کیوں اب کی بہار دیکھ کر
ختم تو تھی ہی زندگی، باغِ بہنِ قفس سی
شکریہ کہ ہوا اسیرِ لطفِ بہار دیکھ کر
ایک سے نہ دن پھرے، اور نہ جہاں واسطے
دورِ فلک بدل گیا دورِ بہار دیکھ کر

عمر تو صرف ہو چکی قیصر قفسِ باغِ باں
 چھوڑ دے اب کہ مر رہوں، ایک بہار دیکھ کر
 بے خبر اپنے جلوہ نورِ سرائے خلقت سے

آئے تھے وہ بھی ہوئی شمعِ فرار دیکھ کر
 بانیِ دل خیز کہا، بیٹھ گئے جھٹکا کے سر
 ہائے وہ اک ٹٹی ہوئی لوحِ فرار دیکھ کر

۲۱- غزل

جنوری ۱۹۱۷ء

اک نظر ہے عمر بھر کی کاہشِ دل کا عوض اک قسم، خونِ صیدِ اربابِ لبِ لعل کا عوض
 غم دیا ایسا، کہ بے نیاسے مستغنی ہو میں اور کیا دیتے وہ اک ٹوٹے ہوئے دل کا عوض
 مل گئیں وہ شوخ نظریں آخواب کیا دیر ہو لے لنگاہِ یاسِ حسرت ہائے لبِ لعل کا عوض
 امن پر غافل نہ ہونا، اضطرابِ موج میں دیکھ لو پنہاں سکونِ سطحِ ساحل کا عوض
 ہو غبارِ راہ کے پردے میں بانی، خاکِ قفس
 عشقِ مہربانی نہیں احسانِ محل کا عوض

۴۰
۲۲- غزل
جنوری ۱۹۱۷ء

جھگڑا ہی چکا، میں بھی چلا، دردِ جگر بھی اب کیا ہو اگر ہوشِ فرقت کی سحر بھی
جاں بہنہ ہوا میں، یہ جدا بات ہو، ورنہ ظاہر ہو کہ ہر شام کی ہوتی ہے سحر بھی
دیکھے گی کسے اُن کے سوا یہ نگہِ شوق مالک ہو جو دل کا وہ ہے مختارِ نظر بھی
کیا عرض کروں منتظرِ جلوہ کی حالت دیکھی ہے کبھی آپ نے تصویرِ نظر بھی

یارا کسے یک جنبشِ ابرو کا ہے آنی
کافی ہے تباہی کے لئے نیمِ نظر بھی

۲۳- دیارِ دوست
مئی ۱۹۱۷ء

نہ تڑپ مرے دلِ مضطرب، کہ دیارِ دوست میں آگیا
وہ دیار جس کا ہر ایک ذرہ سرورِ زادِ فرح فزا
وہ دیار جس کی زمین ہے، غیرتِ آسمانِ چار میں
وہ دیار، ہاں وہ دیار جس پہ قدم ہے تیرے مسیح کا

جدھر آنکھ اٹھا کے نگاہ کیجئے، اک سماں ہی بہشت کا
 کہیں وجد میں ہیں نہال، جھومتی چل رہی ہو کہیں صبا
 کہیں شاخِ سرو پہ قمریاں ہیں و فوہ شوق میں غرو زن
 کہیں نغمہِ بیخ وصال گل کے قریں ہے بلبلِ خوش نوا
 یہ چٹک رہی ہے کوئی کلی، یہ ہوا ہے کوئی شکوفہ وا
 کہ یہ کھل گئے لبِ حور، اور یہ نکلی زفرے کی صدا
 نہیں یہ نہیں میں سمجھ گیا کہ نوائے خندہ گل ہے یہ
 کبھی جس کا ذکر سنا تھا ہم نے، اب اس نہی کو بھی سن لیا
 یہ کچھ ابناط کا جو شش ہے، مگر اے مے دل بتلا
 ترا اضطراب تو اور بھی نظر آ رہا ہے بڑا ہوا
 ٹھہرا بھڑا کے لئے ٹھہر کہ میں صرف سیر بہا رہوں
 تری بے قراہیوں نے تو آہِ محال کر دیا دیکھنا
 تو شگفتہ ہو تو چپلوں ابھی تجھے لے کے کوئے نگاہیں
 ترے ساتھ میں بھی پڑا رہوں، اُسی جلوہ گاہِ بہار میں

یہ بجا ہے تیری نظریں ہو وہ فنا نہ طور و کلیم کا
 وہ ہجومِ شوق، صدائیں وہ ارنی کی اور وہ التجا
 وہ بہت خفیت سی اک جھلک سرِ طور برقِ جلال کی
 وہ غشی کلیم کی اور جل کے وہ سر ہونا پس انداز کا
 مگر ایسی باتوں سے راہِ عشق و طلب میں ہو تجھے خوف کیا
 کہ معیشتیں ہیں مالِ آرزو و منتخبِ مدعا
 نہ رہیں جو ہوشِ ترے بجا، سمجھ اُس کو اندیشِ یک نظر
 اگر اُن کے جلوہ پہ مر گیا تو جزائے دید ہوئی ادا
 تری ہمتوں پہ نثار میں، ترے وصلوں پہ ہوں میں خدا
 مری روحِ لطف اٹھاتی ہے تری اس ادائے جواب کا
 ”کوئی غش ہے جلوہ دوست پر، میں اُمیدِ جلوہ دوست پر
 کوئی جان دیتا ہے وصل میں، میں اُمیدِ وصل پرٹ گیا“
 ہے نویدِ زندگی ابد، دلِ باخبرِ تری یہ صدا
 کہ مرادِ جذبہ شوق سے ہے اگر تو لبِ شمش قضا

نظر آ رہی ہے اسی خیال میں مجھ کو جنتِ آرزو
 اسی ایک بات پہ دیکھتا ہوں میں انحصار سکون کا
 تیری قبر ہو مرے سینے میں، مری قبر کوئے نگار میں
 رہیں آئندہ ہمیشہ پھر، اُسی جلوہ گاہ بہار میں

۲۴ - مہجورِ سیدیا

جولائی ۱۹۱۷ء

کس قدر دلچسپ، کیسا دل کشا نظر ہے آہ
 جھومتا آتا ہے مستوں کی طرح ابرِ سیاہ
 سوچتے ہیں بادِ کش بیٹھے ہوئے عذرِ گناہ
 دیکھ لینا اب نہ ہو گا ان سے توبہ کا بناہ
 لالہ و گل کی لہک ہے دامنِ کسار میں
 شعلہٴ الفت بھڑک اٹھا ہوا قلبِ نار میں
 برق چمکی کالے کالے ابرو دریا بار میں
 یا امید وصل ہے فرقت کے عہدِ تار میں

یہ پرندوں کی صدا سے گونجتا ہے آسمان
 طعنہ زن یا باغِ جنت پر ہے گلزارِ جہاں
 ایک جانب کوئلیں افسانہ سنج بوستاں
 دل کو بر ماتی ہے اک جانب پیسے کی نقاں
 سچ ہے اہل مدعا ہونا مصیبت ہی بڑی
 آفتیں رستی ہیں آئے دن درِ دل پر گھڑی
 نالہ یوں لیکن کہاں کرتا ہے کوئی ہر گھڑی
 لے پیسے، تجھ پر آخر ایسی کیا بتیا پڑی
 اس قدر دل دوز ہو فریاد جس کی الاماں
 کیا غضب ہو گی خدا جانے پھر اُس کی داستاں
 سُننے میں اک عمر سے ہم تو یہی شو ب نقاں
 پنی کہاں ہو، پنی کہاں ہو، پنی کہاں پنی کہاں
 کچھ سُنیں ہم تو بھی کس کی دُھن میں آدہ ہو تو
 ڈھونڈتا ہے کس کو یوں صحرا بہ صحرا، سو بہ سو

ہر نفس تیرا ہے پائے سہی راہ جستجو،
 ہر صد بانگِ درائے کاروانِ آرزو
 تو سراپا شوق بن کر پھرتا ہوں دیوانہ وار
 یا کیا ہے شوق نے خود تیرا غالب اختیار
 تیری ہر آوازیں ارمانِ مضمحل ہیں ہزار،
 آہ اک سازِ تمنا ہے کہ ہے تیری پکار
 نیمہ زن ابر بہاری زیرِ چرخِ پیر ہے
 یاد دھواں ہے تیری آہوں کا کہ عالم گیر ہے
 تو ہوا میں ہے کہ میری آہ خوشِ تدبیر ہے
 عازمِ عرشِ معلّٰی، درپے تاثیر ہے
 تو دلِ عاشق ہے، تیری جان دردِ آرزو
 اور سہی گرم تیری، نبضِ سروِ آرزو
 تو چلا ہے اُڑ کے اے صحرا نورِ آرزو
 یا اُڑا ہے روح بن کر رنگِ زردِ آرزو

اے کہ تیرے واسطے بظنا عَمَّانِ ہجر
 تجھ کو ہر موج ہوا اک موج طوفانِ ہجر
 تو اکیلا، ناخدا کوئی نہ کشتی بانِ ہجر
 اُف یہ جانِ زار، یہ دریائے بے پایانِ ہجر
 اے وجودِ مضطرب، اے منظرِ شانِ فراق
 صبر کر، مٹ جائے گا یہ دورِ دورانِ فراق
 اگر زوئیں یوں اگر میں دشمنِ جانِ فراق
 اک نہ اک دن چاک رکھا ہو گریبانِ فراق

۲۵۔ غزل

نمبر ۹۱۱ء

گلہ کہے ہو، اگر آپ دل نواز نہیں کوئی سلوک ہو بارِ مریں ز نہیں
 جفاؤ ناز میں یہ فرق ہو کہ آہِ رسا حریفِ مخمے جفا ہو، حریفِ ناز نہیں
 شبِ فراق میں ہو ہی سچا کا ختم لے لے اب اس قدر تو فسانہ ترا دراز نہیں
 گناہگار ہوں، اُمیدوارِ رحمت ہوں مجھے عمل پہ بھروسہ نہیں ہے ناز نہیں

بے نصیب کیا زور، ورنہ اے مانی وہ حق گزار نہیں ہیں کہ دل نواز نہیں

۲۶- غزل

جنوری ۱۹۱۸ء

عیادت میں جو میں نیکی کے پہلو اُن کو مت دیکھو
 نہ آؤ دیکھنے مجھ کو، تم اپنی مصلحت دیکھو
 تمنا ہے کہ جیسا میں غمِ فرقت میں ہتا ہوں
 کسی دن تم بھی ویسا ہی مجھے بے عافیت لکھو
 بہت نیرنگیاں اسے دوستو دیکھیں ادھر آؤ
 ہماری بزمِ ماتم، اُن کا جشنِ تہنیت دیکھو
 ادھر آنکھیں تمہاری ترادھر میرا لہو، پانی
 مرے دل کی طرف کتا تھا میں تم سے کہ مت دیکھو
 گلہ کیا، نظر بار اے دل پر ہو تو اے مانی
 تم اُن کی بے وفائی میں بھی پنہاں مصلحت دیکھو

۲۷۔ ناشکیبائی معذور

اپریل ۱۹۱۵ء

صبر کی اس توقع جو خدا را انصاف
 سامنے جس کے وہ آئیں ہوں براگندہ نقاب
 دیکھوں تقدیر کس انجام کو پہنچاتی ہے
 میں نے یوں نہ شوق آؤں نہ ہنس نہ شباب
 پھر غصہ کہ مے بخت کی ہمد شومی
 ان کی آنکھوں میں دت کی جگہ قہر و ختاب
 ان کو پروا بھی نہیں اور میں نے نہ کہناں
 آہ ہاندہ است ز دل قطرہ خونے دریاں
 زندگی کٹنے کو کتنی ہے مگر حال یہ ہے
 چین میرے لئے عقاب ہے مسرت نایاب
 جان ہر آنش اندوہ سے پھکنے کے لئے
 دردِ حواس تڑپنے کو دل خانہ خراب
 حسرتِ خوں شدہ دل سے جو اٹھتا ہو بخا
 انتہا بھی کوئی مجبوری و ناکامی کی
 تاکجا سعی محسوس نہ امید ہو ہوم
 ضبطِ درکارِ محبت مے راں لے چین
 عاشقی صبر طلب اور تمنا ہے تاب
 دل کا کیا حال کروں خون جگر ہونے تک

لہ عنی۔ دریاں کہ ماندہ است ز دل قطرہ خونے ۱۲ لکھ حضرت غالب مغفور ۱۲

۲۸۔ غزل

ستمبر ۱۹۱۸ء

جاؤ بالیس سے اٹھو تو، موت کو آنے تو دو چین سے جینے نہیں تیرے ہو جانے تو دو
صبح تو آخر کو ماتم ہے تمھارا اور میں حسرت تو ٹھہرو، شبِ عدہ گزر جانے تو دو
بس نکا ہو، تم نے نہنچایا پیامِ دلِ بری کچھ وہاں تنگ سے اُن کو بھی فرمانے تو دو
جان ہی سمجھو لے میری مگر ٹھہرو زرا ایک ہی ارمان باقی ہے کل جانے تو دو

کانٹے ہی کانٹے پھیں بستر پہ مانی تو سہی

آرزو کا ایک کانٹا دل میں چھب جانے تو دو

۲۹۔ ”سیاکہ عہد وفا نیست استوارِ بیا“

اکتوبر ۱۹۱۸ء

یہ کیا کہ ہو گئے بیگانہ سلوکِ وفا یہ کیا، بناہ کے وعدہ کی بھی یاد رہی
کسی کی جان پہ پرن جائے گی، نہ سوچا زرا نہ رحم کیا تم نے دئے بے دردی
بتاؤ تو کوئی میرا قصور، میری خطا یہ بے گناہ کی بے کس کی کیوں لے آ رہی

یہی کہو کسی مجبور پرستم ہے ردا چلو طریق وفا سے تم آشنا نہ سہی
 نہیں تھی خیر نہیں تھی تمہیں مری پروا مگر ضرورت تھا، لازم تھا پاس خود داری
 خیال چاہے تھا کچھ شکست پہاں کا نہ تھا بلا سے نہیں تھا لیا دل شکنی

چہ اعتبار قرار ترا وعدہ ترا

”زما گشتی دبا دیگراں گرد بستی“

تمہارا حال یہ ہے، اور مری یہ وہ دلی سوا تمہارے کوئی مدعا نہ کوئی دعا
 تمہارے قدموں میں دیناے آرزو میری تمہاری ایک نظر کائنات و ما فیسا
 ہے غایت پیش قلب شوق جان بازی نہایت غلش مدعا ہے پاس وفا
 میں چاہتا نہیں تم سے جزا محبت کی مگر قرار وفا ہے جب اس قدر بودا
 تو اب ادھر سے بھی پھیر و نگاہ مہربانی مری طرف ہو وہی التفات پہلا سا
 فروغ دیدہ ہو صلت تمہاری چاندی سی تمہارے جلوے سے ہودل کے آئینے میں جلا
 رسیدہ کار بہ جان کے دگر بہ من آئی ”بیجا کہ عہد وفا نیست استوار بیا“

۳۰۔ غزل

نویسنہ ۱۹۱۸ء

ثابت ہو ورنہ فرما جب اُن کی دل نوازی
 بے کار ہے غمت ہے، پھر سہمی چارہ سازی
 تا صبح شامِ فرقت، کیا ختم ہی نہ ہوگی
 میعادِ زندگی میں اتنی کہاں درازی
 مفہومِ حسن و الفت کچھ بھی نہیں مگر ہاں
 میری نیازِ مندی، یا اُن کی بے نیازی
 اے کاش میری حسرت اک نہ عا ہو اُس کا
 مشکل کی جستجو میں ہے جس کی کار سازی
 یہ چھٹیر ہے کہ پرشش لو میں کہوں تو جانیں
 میری المِ نصیبی، اپنی ستم طرازی
 دیکھی ہے کس نے اُمِ دل صبحِ شبِ مصیبت
 مانند شمع ہو جا مصروفِ جاں گدازی

مائی نہیں تو کیسا پھیکا ہے رنگِ گلشن
یعنی بہار کیا تھی، اُس کی جنوں طراری

۳۱- غزل
نوبت ۱۹۱۶ء

میان سے اُن کی تیغِ ناز، آہِ نکل کے رہ گئی
عمرِ ابد کی آرزو، دل میں چل کے رہ گئی
ہمتِ سعی کیا رہے، دل کا تو اب یہ حال
آئی بھی جب کوئی اُننگ، غم سے بدل کے رہ گئی
سینہ سپر امید تھی، ورنہ میں سخت جاں نہ تھا
تیغِ فراق مُڑ گئی، روحِ سنبھل کے رہ گئی
صبح نے بتلا کیا، پھر شبِ غم کے خوف میں
رات بھی میری زندگی، آنکھ بدل کے رہ گئی
مائی بتلا کا دل، کس لئے شعلہ زرا ہے اب
ایک امید تھی سو وہ، پہلے ہی جل کے رہ گئی

۳۲- غزل

دسمبر ۱۹۱۸ء

اللہ آج بعد یک زندگی فرقت
بندہ ہوں میں قیوں ہی کیوں و فرقت
آہی چکی مے سرا آئی تھی جو مصیبت
چھوڑا مجھے انھوں نے یہ راز کب کھلا ہو
اے تو کہ پر دنیا ہو تجھ سے تمام عالم
مر جاؤں گھٹ کے لیکن ضبطِ فغا کرو میں
میں جی باہوں اکب اس کی جواب ہو
تقدیر میں قیوں ہی ٹننا لکھا تھا میرا
کہتے ہیں آؤ پھر ہو تجدید رسم الفت
معلوم ہے تمہیں ہی مجھ سے بڑی محبت
دل جو یوں کی آخر اب ان کو کیا ضرورت
جب ح نے بھی چھوڑی آدل تھی رقت
آجا اوھر کہ میں ہوں محتاج شمع تربت
اب اس کی مقتضی ہو، ظالم کی اس رحمت
کچھ میری سخت جانی کچھ آپ کی نزاکت
تم نے عبت مادی رسم خط و کتابت

کیوں سر جھکا ہوا ہی، کھوئے ہوئے کیوں توج
مانی کی بزمِ غم ہے کیا عرصہ قیامت

۳۳۔ سرا اور شبِ حجب

دسمبر ۱۹۱۸ء

یہ سردیوں کا موسم، یہ ماگھ کا مہینا راتیں بڑی بڑی یہ، صبر آزمائےِ فرقت
 سونا کہاں مجھے تو مثل ہے آہِ جینا ناقابلِ تحمل، میں صدمہ ہائے فرقت
 یہ بھی ہو زندگی کا آخر کوئی قسینا آف، ہنس ہے میرا سازِ نوئے فرقت
 گلزار بن گیا ہے داغوں سے میرا سینا ہی روحِ مجھ میری ریتاں سر لے فرقت
 پر شورِ غمِ نسیم ہے اور زیت کا سفینا زنداںِ نصیبِ دل ہی، اور رنگائے فرقت
 ”اے دوائے برائے کرنا یاد رفتہ باشد“

لکھنؤ

در دام ماندہ باشد صیادِ فرستہ باشد۔“

بھگی بیوات لیکن اکھیل ابھی ہیں تر تاصبح آہ کتنا دل کا لہو ہے گا
 دریائے اشکِ غم نہیں ہو موجِ زن برابر طوفاں یہ کیا تھے گاتجب ڈوبنے دے گا
 کٹ جائیں گے کھ کی گھڑیاں، ایسا کہاں مقدر غم جاں کا ہم نشین ہے، کاہے کو یوں ٹلے گا
 اے کاش تن سے بکھے جانِ جنین مضطر دلِ درنہ زندگی میں کیا خاکِ چین لے گا
 اچھا، بسر کرو گے شبِ کروٹیں بدل کر بس یا نصیب، جو کچھ ہونا ہی، ہو ہے گا

”یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید
دست از طلب دارم تا کار سن بر آید“

بسم اللہ

۳۴- غزل

دسمبر ۱۹۱۰ء

چلین ساحل کو، جب یہ مشورہ میں کیا دل سے
کھاول نے کہ میں متاثر ہو یا رانِ ساحل سے
ستم کوٹ چکا ہوں میں، کرم کی ضرورت کیا
نتیجہ تم نے کیا سوچا ہو اس تحصیل ساحل سے
مجھے حق یقین تھلا کر فرمایئے قسمت کا
آل سعی مستغنی رہا اوہام باطل سے
سنو رو خوب جلدی کیا، انب صفت ہی تو
کہ وقت پر شن ہمارے تو باقی ہو مشکل سے

دُعائیں لے لے، اور بابا جابت عرش پرانی
سافرہ گیا تھک کر خیالِ بے رسل سے

۳۵- غزل

دسمبر ۱۹۱۰ء

ہو کیوں نہ باریا بابا جابت دعائے شب
حامی ہے جو گریہ تاثیر زلے شب
پھر موت کیا بُری ہو، اگر زندگی میں ہو
فکر دوائے صبح و خیالِ دعائے شب

فرقت میں نہ تو کٹ ہی گیا ہاں تو کیا جو ہر خدا روز وہی ہے خدا کے شب
 دن بھر میں گھٹ کے دھم نہ نکلا تو ایک بار میں پھر کروں گا تجربہ نالہ ہائے شب
 باقی کئی گھڑی تھی مرادوں کی ات جب
 مانی نے جان ڈے کے ادا کی بہائے شب

۳۶۔ غزل

دسمبر ۱۹۱۸ء

یہ بند بستی بھی کچھ تو لے کر لیا صیاد
 خبر ہمار کی لائی ابھی صبا صیاد
 افس میں آنے کے باغ کی ہوا صیاد
 اب اور کیا کہوں ہاں نصیب یا صیاد
 جو گھٹ کے آہ مراد من کل گیا صیاد
 شروع میں کیا تھا کہ سو گیا صیاد
 میں کیا کروں کہ ہو گلزار کی ہوا صیاد
 چمن کا بھول گیا ہوں میں رات صیاد
 کل آشیان تو قفس آج اُڑ گیا صیاد
 کہوں چھٹ کے اسیری کا باجر صیاد

تھی ابتداءے بہار ان فصل گل آتی
کہ آشتیاں مرا برباد کر گیا صیاد

۳۷- غزل

جنوری ۱۹۱۹ء

کب کہا ہم نے کہ پہلو میں بہار دل نہیں
سب نے لیکن کیا، اگر وہ نیتِ محفل نہیں
دل تو ہے، ہاں التفاتِ دست کے قابل نہیں
بزمِ حرمِ جہاں بھی کر کیا رہ گیا جب دل نہیں
آنکھ سے اوجھل ہے لیکن جلوہ گردل میں تو ہے
پڑہ و ارجن جاناں پر وہ ٹھہر گیا نہیں
آرزو کو درپے مقصود رہنا چاہئے
آج اگر کبات ہو دشوارِ کل شکل نہیں
پاسِ حکمِ دوست اب ہی تبا، کیا چارہ،
ضبط کرنے پر راضی آج میرا دل نہیں
حشر کے دن میں الٰہی کیوں نہ وہ محسوب ہو
میر جی، ناکام گھڑیاں نہایت میں دل نہیں

یاد دل دیوانہ ہے بے مقصد دے دعا،

یار وہ الفت میں لے آتی کوئی منزل نہیں

۳۸۔ غزل

جنوری ۱۹۱۹ء

پیش کر سکتے ہیں ہم گل کا گلستاں کا جواب
 لائے کوئی گل عذارِ گل بہ داماں کا جواب
 میرے رونے پر تبسم ہالہ دل سے ڈرو
 میں بھی رکھتا ہوں تمہاری برق خنداں کا جواب
 سینہ زخموں سے یونہی معمور رہنا چاہئے
 پھر تو مانگے جس کا جی چاہے گلستاں کا جواب
 زلفیں بل کھانے لگیں سن کر سمجھتا ہوں کہ وہ
 رکھتے ہیں کیفیتِ بخت پریشاں کا جواب
 ڈوبنا عالم کا کیا اچھا ہے آنی ورنہ ابر
 ابر تو کیا دے گا میری چشمِ گریاں کا جواب

۵۹
۳۹۔ تجنیس
(برغزل حضرت غالب مغفور)

جنوری ۱۹۱۹ء

و فوری دردی، میں ہوں، تمنا را از بستر ہے خلسہ پڑا از حسرتِ امینِ خارِ بستر ہے
بہت ٹپا ہوا ہے دل اب کوئی کا بستر ہے پیش سے میری قف کش کش ہزار بستر ہے

مرا سر بچ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

محبت جس کی تابع ہو گیا ہوں کی چوڑی وفا کا جوش کیا ہو خانہ زادِ عشقِ پرفن ہے
جنونِ مضطرب کے لختِ دل کا نام شیون ہے شرکِ سرِ لعلِ دادہ نورِ العینِ دامن ہے

دلِ بے دست پا افتادہ بر خور دارِ بستر ہے

ہوں ان ایامِ پر حسرتِ جمہورت میں گئے ہیں معاذ اللہ کیا کیا ان نوں صد اٹھائے ہیں
زہے قسمت کہ اب غشتِ اراں رنگ لائے ہیں خوشا اقبالِ سخنِ عیادت کو وہ آئے ہیں

فروغِ شمع بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

اجل ہو اصطلاحِ عشقی میں نامِ تنہائی نہیں ممکن کہ جاں بر ہو سکے ناکامِ تنہائی
بیاں کس سے ہو از حسرتِ انجامِ تنہائی بڑھنا کا ہوجِ مضطربِ شامِ تنہائی

شعارِ آفتابِ صبحِ شترتارِ بستر ہے
 ہو، اور باقی ہے گی یاد ان لمحاتِ نرس کی ادا دکھی تھی جب میں جنِ محسن نہیں کی
 نظریں ہو ابھی شوخی نگاہِ سحر آگس کی ابھی آتی ہو بوبالش سے اُن کی نشتِ گل کی
 ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے
 پریشانی ہو فکرِ آبی بیار میں غالب عجب تکلیف ہو بے چارہ گزرا میں غالب
 نہایت جاں گزرا ہو درِ طلبِ میں غالب کہو کیا دل کی کیا تھا ہو ہجرِ یار میں غالب
 کہ مبنیابی سے ہر اک تارِ بسترِ خاں بستر ہے

۴۰۔ استغناء و نومیدی

مارچ ۱۹۱۹ء

یاد ایام کہ تھا دامنِ امید بکث روحِ تھی جامِ مئےِ عشرتِ جاوید بکث
 رہتی تھی ہر شبِ امانِ سحرِ عید بکث آج دلِ داغِ تمنائے ہو خورشید بکث
 یعنی اب وہ سرو سامانِ مسرت نہ رہا قلبِ آرام کا شرمندہ منت نہ رہا
 سازِ ہستی میں مئےِ نعمتِ راحت نہ رہا ذائقہِ زیست کا ممنونِ حلاوت نہ رہا

ابٹ اُمید ہے باقی نہ تمنا باقی حوصلہ کوئی نہ باقی نہ اراد باقی
 شورش و لولہ دل میں نہیں حاشا باقی بسترِ یاس پہ ہوں اور ہے مرنا باقی
 ہی نہ کچھ اُن سے شکایت نہ مقدر سے کلا کہ مرے ذہن میں ہی فلسفہ مہر و وفا
 ان دنوں گور غریباں میں اکثر گزرا مرقدِ مانی مرحوم کا دیکھا کتبہ
 ”وہ نہیں نقشِ وفا و جبہ تسلی نہ ہوا“
 ہے یہ وہ لفظ کہ شہرِ زندہ معنی نہ ہوا“

اب دلِ افروزیِ عشرت بہم نہ ہو سہی روحِ فرسائے اندہ نہ کم ہو نہ سہی
 نالہ میرا نہ حریفِ شبِ غم ہو نہ سہی جو ران کا نہ مبدلِ کرم ہو نہ سہی
 وقفِ بیدار ہوں داؤدِ محبت نہ لے نہ لے آہ مجھے اجرِ مصیبت نہ لے
 دمِ نکل جائے جزائے غمِ وقت نہ لے ہاں میں اضیٰ اصلہ کا ہنرِ لقت نہ لے
 زندگیِ موردِ صدِ کلفت و آلام ہے حسرتِ یاسِ نصیبِ سحر و شام ہے
 ہاں مریِ وح و فاکوشِ غمِ انجام ہے یعنی تقدیرِ محبتِ یونہی ناکام ہے
 وہ مرے دردِ جدائی کا مداوا نہ کریں فکرِ تسکینِ دلِ مضطربِ اصلا نہ کریں
 صرف عیسیٰٰ نفسی مجھ پہ گوارا نہ کریں یہی اچھا کہ وہ بیمار کو اچھا نہ کریں

لب ملیں شکرِ میسجائیں، یہ دم بھی نہ رہا
ضعف یہ ہے کہ سرِ بارِ کریم بھی نہ رہا

۴۱- مخمیس
(برغزل حضرت غالب مغفور)

اپریل ۱۹۱۹ء

جو زرا بھی اُن پہ قابو، جو کچھ اختیار ہوتا

تو دلِ حزن کا اپنے نہ یہ حال زار ہوتا

ہیں کیا سکون ہوتا، ہمیں کیوں قرار ہوتا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

دل اک اضطرابِ قائم ہی، تغیر اس میں کیا

وہی بے قریاں ہیں، یہی شورِ شِمتنا

ہمیں تیرے عہدِ الفت پہ وثوق ہی کہا تھا

تیرے وعدوں پر جے ہم، تو یہ جان چھو جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری بات کی حقیقت میں نہیں ہو شبہ صلا

تو وفا شعار بھی ہے، ترا قول بھی ہے سچا

نہ ہو پھر وفا جو وعدہ تو قصور کیا ہے تیرا

تری ناز کی تھی جانناں کہ بندھا تھا عہد بودا

کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کہے گا کہے گا بے شک مجھے بے نصیب تو

کبھی ٹپس کے مرے سے نہیں آکشنا ہوا جو

دہی جانے جس کے دل میں برتیرہ چھ رہا ہو

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیریم کش کو

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بڑی غم کی داد دی ہو کہ بنے ہیں دست ناصح

مرے دکھ کا پاس بھی ہو کہ بنے ہیں دست ناصح

یہ عجیب دل ہی ہے کہ بنے ہیں دست ناصح

یہ کہاں کی دوستی ہو کہ بنے ہیں دوست ناصح
 کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
 دل زلزلہ مضطرب پر یہ اثر ہوا الم کا،
 کہ لبثل قطرہ خوں مری چشم تر سے ٹپکا
 یہ اثر تو کیا ہے آتا نظر اک عجب تماشا
 رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
 جے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
 گلہ مندیوں سے اپنی دل زلزلہ منفعل ہے
 سر قطع رنج آفت سے نخل بہت نخل ہے
 یہ خبر نہ تھی کہ کلفت تو شریک آب گل ہے
 غم اگرچہ جاں گل ہے، پہ کہاں گنج کہ دل ہے
 غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
 جو کچھ آو پیش آیا وہ غضب کا ماہر ہے
 کہ ہزار بار مر مر کے دل خیریں جیا ہے

جو گزر گئی ہے مجھ پر اُسے کون جانتا ہے
 کہوں کس سے میں کہ کیا ہو، شبِ غم بُری بلا ہے
 مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
 رہی جیتے ہی ہمیشہ یہی عشق میں محسوس
 کہ جہاں سے یوں گزرتے جو کوئی نہ جان سکتا
 مگر اے نصیب یہ بھی نہ ہوا تجھے گوارا
 ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہو کیوں غرقِ دیا
 نہ کبھی جہنا زہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
 متضاد وصف اس کے ہیں نے میں پیدا
 وہ ہوا اول اور آخر وہ نہان و آشکارا
 ہے اگرچہ ذرے ذرے میں وہ نور جلوہ فرما
 اُسے کون دیکھ سکتا کہ یکساں ہے وہ مکتا
 جو دُنی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چاہے تھا
 ترے فیض سے جو انی ہوا تر زبان غالب

تو ٹھنکی حد سے اکثر شعر کی جان غالب
 ہو کلام پاک تیرا کہ خدا کی شان غالب
 یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
 تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خواہ ہوتا

۴۲۔ جہانِ غم

مئی ۱۹۱۹ء

مری داستانِ سرانی میں کہاں ہو وہ حلاوت
 کہ نہاں تھا آہ جس میں کبھی از خواب شیریں
 کسی بزم کی ہوں وقت کسی دل کی ہوں سرت
 مجھے یاد ہی نہیں اب وہ ترانہ ہائے رنگیں
 مرے نغموں کا یہ عالم مرے ساز کی یہ نوبت
 نہیں توتے یک نفس بھی یہ حریف کبر تمکین
 مری ذات سے مکدر نہ ہوا ک خوشی کی صحبت

وہ روش معاشرت کی نہ وہ زندگی کا آئیں
 نہیں اُن کی بارگاہ میں مری جا تو پھر گلا کیا
 کہ خزاں رسیدہ پتوں سے چین میں عاکیا
 نہ زرا کروں گا پروا، مجھے حسرتیں ستائیں

مرادل ہزار تڑپے نہ مناؤں گا کبھی غم
 نہ کروں گا اُف، جو مطرب مجھے تہنیت سنائیں
 کہ آنھیں خوشی مبارک، تجھے حسرتوں کا ماتم
 مجھے یہ ہوس نہ ہوگی کہ وہ بزم میں بلائیں،

کسی بے نوائے دیکھا کبھی خوابِ محفلِ جم؟
 نہ گلہ کروں گا اُن سے نہ کروں گا التجائیں
 مگر اپنے آستاں سے نہ اٹھائیں ہوس کے پریم

”بہ ملازمانِ سلطان کہ رساند این دُعا را

کہ بہ شکر بادشاہی تو ز در مراں گذارا“

۱۔ حضرت حافظ شیرازی مغفور۔

مجھے آم یاد آیا وہ گیا ہوا زمانا
 کہ سرورِ عیش تھا جب مری زلیست عبات
 نہ خلش تھی مدعا کی، نہ یہ کاہش تمتا
 نہ یہ سوزش آرزو کی، نہ فسر دگی حسرت
 نہ سیرِ ملال پیرا، نہ دلِ الم سویدا
 نہ خیالِ غم تراوش، نہ جگرِ ستم جراح
 مگر اب تو کوئی دیکھے یہ نصیب کا پلٹنا
 یہ ہجومِ یاس و حراں، یہ فورِ درد و کلفت
 تو پھر اس سے کیا جو مجھ کو ہو غم جہاں فرصت
 کہ جہاں غم ہے تانیِ قفسِ اسیرِ الفت

۴۳۔ تجنیس

(برغزل حضرت غالب منفور)

مئی ۱۹۱۹ء

وہ ستم گار کہ بے میرے ستائے نہ بنے میں فاکیش کہ لب پر گلہ لائے نہ بنے
اور تو اور زباں بھی تو ہلائے نہ بنے نکتہ چیں ہو غم دل اس کو ستائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

قیس کے نالہ شب کا تو سنایہ حاصل صبح کو نجد میں لیلے تھی اور اس کا محل
یوں ہی آسان ہوئے کاش مری بھی نکل میں بلاتا تو ہوں اس کو، مگر لے جذبہ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

نسبت باہمی قاتل و مقتول نہ جائے اس کی سفایوں کی عادت مقبول نہ جائے
کم سے کم میری دل آزاری کا معمول نہ جائے کھیل سمجھا ہو کہیں چڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن سکے ستائے نہ بنے

بسکہ تھا ہاتھ دکھانے میں بھی سوائی کا ڈر خطِ تقدیر بھی میں نے سنا پڑھوا کر
مجھ کو ناکامیوں میں بھی یہ پاس اور دھر غیر پتہ رہا ہے لئے یوں سے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

وہ بڑے اہل مروت ہیں بڑے اہل وفا مجھ کو ان سے نہ ستم کا نہ تغافل کا گلا
ہاں مگر ہر تو ہو نازک بدنی سے شکوا اس نکتہ کا بڑا ہوا، وہ بھلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
 ہو جو سوچ میں یہ آتش نظری کس کی ہو ظلمتِ شام و ضیائے سحری کس کی ہو
 یہ بساطِ فلکِ سیلو فری کس کی ہو کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہو
 پردہ چھوڑا ہو وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

نغم کی خیر نہ مانگوں کہ بڑے اور بڑے لذتِ درد نہ چاہوں کہ ترقی ہی کسے
 تربیتِ غم کو نہ دوں میں کہ نہ جادو سے موت کی اہ نہ دیکھوں کہ بنائے نہ ہے
 تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

اُن کی تھی کبھی اندیشہٴ رسوائی سے آج ممکن نہ ہوا ضبطِ بے اشک ہے
 عذر بھی اُن سے کروں تو یہ کیا مانیں گے بوجھ وہ سر گرا ہو کہ اٹھائے نہ اٹھے

کام وہ اُن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
 جب ہے شیفۂ شہنشاہِ پری و شِ غالب زیستِ آبی کی فقط نالہ ہے یا غشِ غالب
 چارہ کیا ہو بجز اندوہ کشاکشِ غالب عشقِ پرور نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالب
 کہ لگائے نہ لگے اور بھجائے نہ بنے

۴۴- غزل

جون ۱۹۱۹ء

آج تو ظالم کی آنکھوں میں دت ہی تھی مجھ میں اور اُس میں کبھی جیسے محبت ہی تھی
 مرنے والے پر یہ ہمت ہو کہ آفت ہی نہ تھی کہے اُس کی زندگی کیا تھی مصیبت ہی تھی
 وہ جو روٹھے میں نے سر قدموں پر رکھ کر بجا دی اور تو کوئی منالینے کی صورت ہی نہ تھی
 اُن کی ملکیت تک نہ بھیگیں سُن کے افسانہ مرا یعنی گویا وہ محبت کی حکایت ہی نہ تھی
 اب بھی ایو داعظ وہی تھو لینا اردو گیر حشر آپ کے نزدیک چال اُن کی کیا ہی نہ تھی
 آکھ اب اس امید حشر دوں اے شوق دید زندگی میں تو غم حریاس فرست ہی نہ تھی
 نام لوں کس کس کا لے مانی کہ عہد ہجر میں اور دشمن بھی بہتے ایکے ت ہی نہ تھی

۴۵- کش مکش امید

جولائی ۱۹۱۹ء

جو ٹپکے اشکِ غم نے کہا رازِ دردِ الفت
 تو دھڑک کے قلبِ مضطرب نے مریہ دی گواہی

یہ خلش کی لذتیں ہیں کہ ہیں رہبر تنہا
 یہ اُمید ہے کہ کرتی ہو خلش کی سربراہی
 نہ اُمید ہی ٹلے گی نہ یہ کش کش ٹٹے گی
 مرے دل پہ حکم راس ہو جو یہی کرم نگاہی
 رہوں ضبطِ غم میں کوشاں نہ فغا کروں نہ رُوں
 نہیں بچے بس کے اب تو یہ اوامر و نواہی
 نہ کہیں مرا ٹھکانا، میں کہاں ہوں الٰہی
 مرے دل میں خاک اُڑتی ہو، یہ جانتا ہو لیکن
 نہیں جانتا کہ رونق کہوں اس کو یا بتا ہی
 مجھے ظلمتِ دنیا میں نہیں اتیا زبانی
 میں نہ جانوں دن ہیں وشن کہ ہو اتیا سیلا ہی
 ہے تمام دن تصور کہ وہ شاید آئیں شب کو
 ہمہ شب دریں اُمیدم کہ نسیم صبح گاہی

حضرت حافظ صاحب دہلوی

بہ پیام آشنائے ہوا زو آشتا را

۴۶- غزل

جولائی ۱۹۱۹ء

عشرتِ عہدِ گزشتہ کو بس اب یاد نہ کر لے دل اس طرح تمنامری برباد نہ کر
کہنے سننے سے خیالِ دل ناشاد نہ کر جی میں ہے وہی کیوں مہم ایجا نہ کر
خستہ رنگ لے خاموش ہوا وہ قیدی کل جسے حکم دیا تم نے کہ ف یاد نہ کر
ہم نفسِ ناں گلہ جاز نہیں میں بھی چپ ہو تو بھی بے کز خوشِ اخلاقی صیت یاد نہ کر
ہائے رونا تو ہو عادتِ تمی اب لے آتی
کچھ نیا شیوہ اظہارِ غم ایجا نہ کر

۴۷- غزل

جولائی ۱۹۱۹ء

تیری پیش سے سکوں ہوتا ہوا سے قاتلِ بہت

ورنہ یوں تو شہر میں پرسانِ حالِ دل بہت

موت دے گی چپ کی داد اے آشنائے ضبطِ غم

اور تھوڑی سی، اب نزدیک ہے منزل بہت
 دل نہ دیکھا پھر جو تھا لیلے کی گردِ راہ میں
 یوں تو دیکھے نجد میں ناتے بہت محل بہت
 سنتے ہیں اعجازِ تسکین آپ کے ہاتھوں میں
 ہم بھی دیکھیں گے ترپتا ہو ہمارا دل بہت
 ہم نے مانی تجزیہ عمرِ محبت کا کیا
 عنصرِ کاہش ہے اس کم سخت میں شانِ بہت

۴۸- غزل

جولائی ۱۹۱۹ء

بجا کہتے ہو تم بیجا تھی جو دل کو شکایت تھی
 نہیں بخش نہیں، تمہیدِ تجدیدِ مسرت تھی
 تلافی کی دم آخر کسی کو کیا ضرورت تھی
 کہ میری موت ہی تمہا جزائے رنجِ الفت تھی
 نہ پوچھو کیسی لذت آفریں اُن کی محبت تھی

مصیبت جس کی راحت اُس کی راحت کیا تھا
 فضا تھی سو گوار ایسی ہوا تھی بے قرار ایسی
 انھیں کیا تھا، اگر تھی بھی تو میری شامِ فرقت تھی
 چلو بھی کس لئے آنسو بہاؤ قبرِ عاشق پر
 دُہی تو ہے جسے تم سے توافل کی شکایت تھی
 حکایتِ اشکِ غم کی جھوٹ، لیکن اس کو کیا کہئے
 کہ میرے ہر نفس میں آہِ بوئے خونِ حسرت تھی
 وفا کا ذکر سن کر آج کہتے ہی بنی اُن کو،
 کہ مانی کو خدائے بخشے، وفا مانی کی عادت تھی

۴۹- غزل

اگست ۱۹۱۹ء

کس کے سہارے ہے، آہ اُمید وصال
 اب تو گزر ہی گیا، عیدِ سعید وصال
 ہو رمضان سال بھر، شرط ہو اتنی مگر

یعنی کہ ہر روز کے بعد ہر عید وصال
 دل پہ نہ معلوم کیوں نقش ہوئی ورنہ تھی
 غصہ ر و حایتِ گفت و شنید وصال
 کاش کریں منحصراً قتلِ مرا وصل پر
 وعدہ نہ فرمائیں وہ بلکہ و عید وصال

جینا تھا آئی تھے اور ابھی چند روز
 لے وہ بہت کم سہی تھی تو امیدِ وصال

۵۔ غزل

اگست ۱۹۱۹ء

سخت جاں ہوں، دیکھے حسرت پہ کیا بنتی ہے آج
 ایک تو نازک ہے قاتل دوسرے نازک مزاج
 جذبِ دل کو کہہ دیا میاں الفت اُس نے آج
 اب حذر رکھے تو رکھے اُس کی خود داری کی لاج
 نبضِ ڈھونڈھیں سر کو زانو پر جو رکھنے آئے ہیں

آہ دل جوئی کی اب باقی نہیں ہے احتیاج
 کیسی صحت کی توقع، میں تو واقف ہوں کہ ہر
 آپ کی چٹون کی شوخی میرے دل کا اختلاج
 وعدہ کر لو گے تو لازم ہوگی تکلیف و فنا
 کیوں مٹا ہی کیوں نہ دو تم عہد و پیمان کا رواج

۱۵۔ غزل
 اگست ۱۹۱۹ء

کسے خبر کہ ہوا ہوں کب اور کہاں برباد
 ارے کچھ آج سے ہو کیا میں خانماں برباد
 اب اور حشر میں کیا طرہ نہ ماجرا ہو گا
 کہ آج بھی تو ہے حسرت کا اک جہاں برباد
 نہ اُن پہ زور نہ دل بس میں اُسے مجھو سی
 سکوت بے اثر و شور شش فغاں برباد
 کوئی بتائے کہ آبادیاں تھیں کہاں میں

تو میں بتاؤں کہ کب سے ہواشیاں برباد
حیات و موت سے واقف نہیں گمراہی
کیا ہے مجھ کو محبت نے نوجواں برباد

۵۲- غزل
اگست ۱۹۱۹ء

جینے سے یہ بنیر مر اقلبِ خریں ہے دنیا کا ہو کیا ذکر غم اُن کا بھی نہیں ہے
کیا ہے کہ مجھے دیکھ کے کہتا ہو زمانہ کچھ اور ہو اس کو غم دینا تو نہیں ہے
تم ہو جو فادار تو کچھ غم نہیں یعنی اب جی سے گزرا مجھے شوار نہیں ہے
میں عبد و فاسک بھی دیتا ہوں لیکن کیا سچ کے و ماہوت معلوم نہیں ہے

ہاں موت تو آئے گی اگر چہیں نہ آئے
مائی شبِ غم روزِ قیامت تو نہیں ہے

۵۳- غزل
ستمبر ۱۹۱۹ء

جی میں آتا ہے کہ روئیں اپنی بربادی پہ ہم

آہ لیکن کیا منائیں آپ کی شادی کا غم
 کاش نکلے آپ کا ارمان عیش بے خلش
 اور مرے سینے سے نکلے خارِ غم یعنی یہ دم
 آہ، میں مرجاؤں یا جی جاؤں اس سے بحث کیا
 مقصدِ جاں جنبش لب ہی، کہو لایا نفسم
 کچھ خبر ہے پاؤں میں زنجیر پہناتے ہیں لوگ
 تیرے دیوانے کو دے دے گدگدے سر کی قسم
 مانی ناکام حسرت کو بھی کر لیتے ہو یاد
 پیچ بتانا تم کو عیش کا مرانی کی قسم

۵۴- غزل

ستمبر ۱۹۱۹ء

کیا کروں میں، ہو تو ہو ان کو پریشانی بہت
 مجھ کو بھی پیاری ہے اپنی نالہ سانی بہت
 زلیست کی آسانیاں میرے لئے دشوار ہیں

مجھ کو ان دشواریوں ہی میں ہے آسانی بہت
 خاک میں مجھ کو ملا کر آپ اتراتے تو ہیں
 ہے ندامت خیر انجام ستم رانی بہت
 میرے کہنے کی نہ پوچھو اپنے سُسنے کی کہو
 در نہ میری داستانِ غم ہے طولانی بہت
 منہ سے کچھ کہتا تو سُنتے، ہاں یہ دیکھا ہی ضرور
 رو رہا تھا آج منہ ڈھانپے ہوئے مافی بہت

۵۵۔ فریبِ فنا

ستمبر ۱۹۱۹ء

ہاں مجھے تم سے تغافل کا گلہ بھیجا ہے
 جبکہ اُس نے ظلم بھی سہا دیکھا ہے
 ہاں عیثِ محض عیثِ شکوہ بے پروائی
 جبکہ اک شانِ تمہاری ستم ایسا دیکھا ہے
 تم نہ گھبراؤ شکایت نہ کروں گا لیکن
 یہ تباہی مجھے تم سا کوئی جلا دیکھا ہے
 تم نے جو درسِ محبت کا دیا ہے مجھ کو
 محو کر دے اسے ایسا کوئی استاد بھی ہے

نقشِ باطل کی طرح آج مٹاتی ہو مجھے ابتدا عہدِ محبت کی تمہیں یاد بھی ہو
 مجھ کو گھر بیٹھے وہ پیغامِ متنا دینا یعنی موجود ہو شیریں کوئی فریاد بھی ہو
 مجھ کو لکھنا کہ ٹپتی ہوں تری قس میں درد بھی دل میں ہو، لب پر سے فریاد بھی ہو
 اے تری ناصیبانی کی تنائوں میں آستانِ دردِ صدر لرزہ بنیاد بھی ہو
 پھر مے آنے پہ شوقِ حیا کے انداز تم وہ بل تھیں کہ جو قید بھی آزاد بھی ہو

مدعا ناز کا حسنِ طلبِ عرضِ نیاز

مقصدِ جلوہ کہ ٹھنک جا کرے صبر کا ساز

گو خوش آئند تھا آغازِ محبت لیکن فکرِ انجام سے پھر بھی ہیں پریشان ہوا
 دل میں کہتا تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے یا ز آہ، کیسا مے مٹ جا سکے سامان ہوا
 ساتھ ہی خطرہ ناکامی الفت بھی رہا کامیابی کا جو دل میں کبھی ارمان ہوا
 اسی الجھن میں وہ گھبر کے مرا لکھ دینا خیر وہ ہو چکا تب جو مری جان ہوا
 خیریت ہی ابھی چھوڑ دمری الفت چھوڑو تم بھی اب صبر کرو، میں بھی ایشیاں ہوا
 درنہ باد کرو تکمیلِ محبت کے بعد حشر ہو جائے گا، دل میرا جو ویران ہوا
 کیوں مئی احتِ دل یاد ہی یا بھول گئیں یہ لکھائیں نے تو پھر کیا مجھے فرمان ہوا

یعنی کیا کہتا ہو تو صبر کروں میں کیونکر اہل الفت کو کہیں صبر کا امکان ہوا
تو نہ گمبھرا کہ تیر ہی ہوا فقط تیری ہوں کیوں پریشان ہوا کہ ہے کویشیان ہوا
تھایہ مطلب نہ جدا باغ سے مالی ہو جائے
صید رنجور سے فراق نہ خالی ہو جائے

کامیابی کا یقین تم نے دلایا لیکن ہر گھڑی تھا وہی اندیشہ انجام مجھے
یعنی کیا ہوگا، اگر بڑھ گئی الفت میری اور تقدیر نے رکھا تو نہیں ناکام مجھے
الغرض چین نہ پاتا تھا جو دم بھر دلدار آخرش پھر وہی دنیا پڑا پیغام مجھے
پھر لکھائیں نے کہ چھوڑ دو میری الفت چھوڑ دو کیوں بناتی ہو عبث مرکز آلام مجھے
نہ میسر ہو کہیں تلخی ناکامی عشق، ہو گوارا جو ملیں زہر کے سو جام مجھے
تم جو کہتی ہو، یہ بار نہیں ہوتا مجھ کو اس تسلی سے تو ملتا نہیں آرام مجھے
باوجود اس کے مری ایکٹ انی تم نے موردِ لطف ہی رکھا سحر و شام مجھے
رفتہ رفتہ وہی وقت آیا کہ اب جذبہ ضبط ناشکید بانی کا دینے لگا الزام مجھے
مٹ گیا لوحِ دل غم زدہ سے صبر کا نام اسی فریاد سے تھا آٹھ پہر کا نام مجھے
سینہ ز آتش دل در غم جانا نہ لبوخت رخصت ہو گیا

آتشے بود و در این خانہ کہ کاشانہ بسوخت

بد سے بدتر ہو جب ازل خانہ خراب
میں کی عرض، انہیں بس میں طبعیت میری
او، میں جس کے تصور سے لرز جاتا تھا
دیکھتا ہوں کہ وہی ہو گئی حالت میری
یا تو آ جاؤ تم اب یا یہ اجازت مجھے دو
کہ چلا جاؤں جدھر لے چلے دخت میری
یا وہی یا نہیں، کس درد سے لکھا تم نے
کہ نہ جا، اور نہ کر ترکِ فاقہ میری
تو مجھے چھوڑ کے جاتا ہے گر سوچ تو لے
کیا ترے ہجر میں ہو جائے گی نسبت میری
ہائے افسوس میں مٹ جاؤں گی مر جاؤں گی
تیرے صلے، نہ سازِ لیست کی صحت میری
جلد جاؤں گی تجھ سے میں ہمیشہ کے لئے
کہ تری ذات سے وابستہ ہو حسرت میری
چند ہی ن بھی ان باتوں کو گزرے تھے کہ
تم مجھے چھوڑ گئیں کیا کہوں قسمت میری
اب تو دل ہو گلا جو کاکا سا زخمِ خوش،
اور زباں پر یہ ناکام حکایت میری

شریبہ ازلِ لعلش نہ چشیدیم برفت
روئے یہ بیکرا و سیر ندیدیم و برفت

۱۰ حضرت حافظ شیرازی مغنور۔

اب خدا کے لئے آنا تو بتا دو مجھ کو کیا جو کچھ عرض کیا میں نے غلط عرض کیا
یا خلافت اپنے کوئی بات چھپالی میں نے یا کوئی امر ٹھہرایا جو موافق مرے تھا
بعد اس کے مجھے یہ اور بتا دو مری روح سارے اس دور میں پاتی ہو کہیں میری خطا
تم نے جو حکم دیا اس پر کیا میں نے عمل جو کچھ ارشاد تھا راجہ ہوا میں نے مانا
یہ حکایت ہو اگر بیچ تو زرا غور کرو بے وفائی مری جانب سے ہوئی ہے کہ وفا
اور اگر جھوٹ ہے سب کچھ تو چل جائے دو تم یہ کہہ دو کہ غلط ہیں کہوں بیچ تم نے کہا
بے وفا، ہر نہ دراپنے کو تسلیم کروں صادق القول تمھیں مان لوں اور اہل وفا
فیصلہ حشر میں ہو جائے گا اور جیتے جی سچی ہوگی کہ زباں پر نہ تھاں ہو نہ گلا
اب ہا دل، سو یہ ہو اور رہے گا بیتاب غالباً قبر میں بھی چین نہ لینے دے گا

”بلکہ مردن ز جھائے تو اگر یاد کنم

از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

بعض اوقات سمجھ میں ہی آتا ہی نہیں کون سا نغمہ ہے غم، اور خوشی ہے کیا ساز
تنگی قید ہو یا وسعت آزادی ہو ایک میں کیونکہ نہ گلشن ہو نہ تاب پرداز

آہ اب کیا ہو، کوئی چند نفس باقی ہیں، کہ پڑھیں صاحبِ دل میت عاشق پہ ناز
 بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں ہمیشہ کے لئے اُن، غیبِ آبِ درِی زفر نہ سوز و گداز
 تم ہوا ب اور بصدِ رنگ گلستان ہونا، مٹ گئی ساوگی عہدِ تمنا آغاز
 تابو نہاد کشِ حسنِ نیاز عشاق شاہِ آباد ترا سلسلہ ناز و راز
 میں تو ساکت ہوں کہ دہم کی طاقت نہیں دے رہا ہوں دل پر جوشِ مگر یہ آواز
 ”عاقبتِ منزلِ وادیِ خاموشاں است حالِیا غفلتِ درگبندِ افلاک انداز“
 قصہ عمرِ ثواب ختم ہے اے مانی سن، فاش کر دے اسی قصے کے نتیجے میں راز
 ”دھرمِ نقشِ وفا و حبہ تسلی نہ ہوا

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا“

۵۶۔ آہ نارسا

نومبر ۱۹۱۹ء

امری احتِ دل، ہیں متقاضیِ احباب کہ سناؤں انھیں کچھ حالِ دلِ خانہ خراب

ٹال دیتا ہوں میں سب کو بیٹی کی دیکھو جواب کیا کہوں آہ، کہ مجھ میں تو نہیں شرح کی تاب

کاش تم ہو تیں کہ یہ ذکر سنا تا تم کو

لالہ زارِ دل پر داغ دکھاتا تم کو

یوں تو الفت کے زمانے میں نے ہیں بہت نغمہ ریزانِ محبت کے ترانے ہیں بہت

لیکن اک آہیں دکھ مجھ کو سنانے ہیں بہت جن کے سننے کو بھی غیر ادراک گانے ہیں بہت

تم مگر کاشش یہ آہِ دل مضطربیتیں

غم گاری نہیں، نفرت سمجھ کر سنتیں

لیکن بے جا بننا تھیں کیونکر پاؤں کہ یہ افسانہ اندوہ والہم دو ہراؤں

دم کسی طرح نکل جائے، کہیں مرجاؤں آہ کیونکر دلِ حسرت زدہ کو بہلاؤں

کتنی مدت اسے گزری کہ جدا ہو مجھ سے

یہ بھی معلوم نہیں خوش کہ خفا ہو مجھ سے

ہاں، کھٹارا میں گہنگار ہوں اتنا تو ضرور ضبطِ آثارِ محبت میں ہوا مجھ سے تصور

کچھ تو یہ بات ہے، کچھ یہ ہے کہ اسے غیرتِ حور امتحانِ اثرِ حسنِ تمھیں تھا منظور

تم ہوئیں جلوہ نابرق تجھے کی طرح

اور میں بے ہوش ہوا حضرت موسیٰ کی طرح
 خیر میں اقصا سرا حقیقت ہی نہ تھا دل مر قابل انعام محبت ہی نہ تھا
 یعنی کم محبت کو یارائے مصیبت ہی نہ تھا ورنہ غم مقفی شور قیامت ہی نہ تھا
 ہاں تو پھر مجھ پہ یہ بجلی نہ گرائی ہوتی
 آفتِ حسن کسی اور پہ ڈھائی ہوتی
 کس کو منظور تھا برباد جوان ہو جانا اک شگفتہ چمنِ دل کا خزاں ہو جانا
 التجا کب تھی کہ یوں جلوہ کناں ہو جانا برقِ سوزندہ پئے خمین جاں ہو جانا
 اور جو میں نے ارنی تم سے کہا بھی ہوتا
 لن ترانی تمہیں کہنے میں تکلف کیا تھا

۵۷ - تخمیں

(برغزل حضرت غالب مغفور)

جنوری ۱۹۲۰ء

جنابِ مفتوح اس سے تو خانہ زاد نہیں کہ ہجر دوست قیامت کی روکڑا نہیں

گر میں خسر سے منکر ہوں، یہ مراد نہیں نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

شبِ نفاق سے روزِ جزا نیا دہنیں

فلکِ جہی میں کچھ آج امتحاں کی آئی ہے زرا سی دیر کی یہ صبر آزمائی ہے
اُداسیوں کی گھٹا کونوں پہ چھائی ہے کوئی کہے کہ شبِ مہر میں کیا بُرائی ہے

بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

یہ حکم ہے کہ انھیں دشمنِ وفا نہ کہیں عدوئے جانِ دہلِ اہلِ مدعا نہ کہیں
مگر یہ حال ہو ان کا تو لوگ کیا نہ کہیں کبھی جو سامنے آؤں تو مرجانہ کہیں

جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

میں کیا بتاؤں کہ کیوں اشکِ نکتِ بہتے ہیں ہزار طرح کے غمِ اہلِ عشق بہتے ہیں
یہ رو رہا ہوں کہ یوں تو بھلائے تھے ہیں کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ کو فنا دہنیں

مبارک اوروں کو امیدِ اجرِ یومِ حساب مبارک اوروں کو دن بھر کا صومِ او ثواب
یہاں مے کی کمی ہے نہ تنگی کا عذاب علاوہ عید کے ملتی ہو اور دن بھی شرب

گدا کے کوچہ مے خانہ نامراد نہیں

نہ چھپر تندرہ دفع گردشس ایام خوشی کا نام نہ لے ہم ہیں غور گرام
نصیب بوی میں ہر جب کھ تو پھر کہاں آرام جہاں میں ہوں غم و شادی ہم بہت کام

دیا ہے ہم کو خدا لے وہ دل کہ شاد نہیں
نہ بتلا کرو کاہش میں جان کو غالب بس اب سکوت میں تانی کا ساتھ دو غائب
امیدِ عیش میں کیوں ریخ مول کو غالب تم ان کے وعدہ کا ذکر ان کے کیوں کہ غائب
یہ کیا کہ تم کہو، اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

۵۸۔ غزل

فروری ۱۹۲۰ء

ناحق احباب منافق مرے بدنام ہے خود یہ تقدیرِ محبت ہو کہ ناکام رہے
دم نکل جائے گردل یو نہیں ناکام ہے جی کی خاطر مری الفت تو نہ بدنام رہے
طول بے اور مری مدتِ غش کو یعنی اور آغوشِ تجلی میں ترا بام رہے
دن پڑا ہوا بھی اور میں ہوں چراغِ سحری منتظر کون تے و عکس کا تا شام رہے
بنی عاشق کوئی بقراط ہو ناصح کہ جسے عہدِ غار میں اندیشہ انجام رہے
کب میں سمجھا کہ سزاوارِ محبت ہی نہ تھا جب طاقت نہ رہی دل میں ناکام رہے

وقت آخر ہے چلو دیکھ نہ لو مآتی کو،
کہ جو مر جائے تو تقدیر پہ الزام ہے

۵۹- غزل

مارچ ۱۹۲۰ء

ہے بحث تو یہ کہ دل حریفِ بلائے الفت ہے یا نہیں ہے
نہ یہ کہ الفت مری قضا ہے تمہاری تیغ ادا نہیں ہے
کبھی نہ بولوں گا، یہ تو میرے سکوت کا مدعا نہیں ہے
ترمی شبتانِ ناز ہی، کیا کہوں کہ روزِ جزا نہیں ہے
عجبت بلا اپنے سر پہ لیتے ہو پا یہ زنجیر کر کے مجھ کو،
ارے نکل جاؤں گا کہیں میں کہ تنگ ملکِ خدا نہیں ہے
نہیں، نہ سمجھو کہ میں بھی ہوں ان تمھارے فریادیوں میں شامل
مگر کہاں جاؤں عرصہ حشر سے کہیں راتا نہیں ہے
گدا کو دم بھر میں یا الہی تو بخش دیتا ہے تاج شاہی
مجھے دیر مدعا عطا کر ترے خزانے میں کیا نہیں ہے

اجل تو تھی ہی مگر تفاوت ہے وصل و فرقت کی جان ہی میں
 تم آگے بس، یہی تنہا تھی، اب کوئی مدعا نہیں ہے
 نہیں ہو تم ملقت ابھی، اس لئے ہر دعوئے پاک بازی
 وفا جسے کہہ رہا ہے مانی، فریب ہے یہ وفا نہیں ہے

۶۰۔ غزل

جولائی ۱۹۲۰ء

تجسس ہو تو مل جاتا ہے سب کچھ دار امکاں میں
 کوئی لمحہ خوشی کا آؤ ڈھونڈھیں عمرِ انساں میں
 چراغ اک اُن کی محفل میں ہر اک میری شبستاں میں
 یہاں تصویر یا بوسی ہے، رونقِ بزمِ جاناں میں
 جنوں کی یادگار اک آشیانہ ہے گلستاں میں
 عبث تنکے چنے تھے میں نے کیا فصلِ بہاراں میں
 نہ ہوتا عشق سے مضطر تو کیا دل کو سکوں ہوتا
 سکوں کا ذکر ہی کیا سایہ گردونِ دوراں میں

کھلے ہیں پر، کھلا ہے در، مگر کب، جب خزاں آئی
 میں کہتا ہوں، تفس میں مر رہوں اب یا گلستاں میں
 میں لیتا رخصت یک نالہ اور خاموش ہو جاتا
 تفس اک بار اگر صیاد رکھ دیتا گلستاں میں
 کبھی طرح دل آزاری تھی، لیکن اب تو اے مانی
 ادا کئے جاں نوازی دیکھتا ہوں دردِ ہجراں میں

۶۱۔ غزل

جولائی ۱۹۲۰ء

جب مکمل مری تسلیم کا قصانہ ہوا تو بیاں آپ کی بیداد کا افسانہ ہوا
 سرمہ ہو کر ہی سہی، طور کی مٹی تو رہی دل تو اتنا بھی حریفِ رخِ زیبا نہ ہوا
 حاجی بہت مردانہ ہے تقدیر کہ دیکھ آدمی بن کے رہا وہ کہ فرشتانہ ہوا
 ہاں سُنا خوب سنا تذکرہ طور و کلیم کیا کروں ہائے مرا عہدِ ثنّانہ ہوا
 اس حقیقت پہ یہ طوفانِ بڑی خیر ہوئی کہ دل اک خون کے قطرے سے زیادہ نہ ہوا
 زندگی میں مری فریاد اب اُن کے آنسو عشق کس حال میں کس عہد میں رسوا نہ ہوا

ساغر دیدہ جاناں چھلک آئے مانی
آج لبریز مری غم سر کا پیمانہ ہوا

۶۲۔ قطعہ تارخ

وفات رفیقہ حیات

مئی ۱۹۲۱ء

ماہ شعبان کی شب بست و یکم

۱۳۳۹ ہجری

عبث تھا میرے پاس غم سے ضبط درد پہ نانی
گوارا تھی تھیں جب اس طرح میری پریشانی
تمہارا لہنس جس کے لئے آغوشِ عشرت تھا
ہو اب آہوں کے گہوارے میں وہ میری تن آسانی
مری ہم عمر تھیں، ہم راز تھیں ہم درد وہم دم تھیں
یہ رشتے سب کے سب توڑے، مجھے چھوڑا یہ کیا ٹھانی

بگڑتا کیا جو کچھ دن اور رہ کر ہم سفر ہوتیں
 کہ میں بھی چھوڑنے کو تھا سرائے عالم فانی
 ہوئیں تم رونق شہرِ خموشاں جب تو میں سمجھا
 کہ اک بستی کی آبادی ہے میری خانہ ویرانی
 عجب دلچسپیاں ہیں قبر پر، ہر روز سنتا ہوں

یہ دل کا نذیرِ غم نوحہ آرامِ روحانی
 رفیقہ کی لحد ہے یا کہ یہ تصویرِ عبرت ہے

۶۱۹۲۱
 مرے ہی گھر کا یہ بگڑا ہوا نقشہ ہوائے مانی
 ۱۳۳۹ھ

۶۳۔ تجھ میں

(برغزل حضرت غالب مغفور)

ستمبر ۱۹۲۱ء

آہ پا مالِ ستم کیوں دلِ ناشاد نہیں میں تجھے یاد دلاتا ہوں اگر یاد نہیں

بخدا اور کوئی مقصد فریاد نہیں نالہ جز حیرت طلب اے ستم ایجا دہنیں
ہے تقاضائے جفا شکوہ بیدادہنیں

راہ الفت میں ہی یہ مرحلہ نو کیا خوب مطلب غیر کی خاطر ہو تکا دوو کیا خوب
پھر نہ عوی کہ ہو شیریں سے لگی لو کیا خوب عشقِ مردوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نہ کو نامی نہ رہا دہنیں

ہاں پہنچ ہو کہ اگر عشق ہو دشتِ مازوم اور دشت کا ہو ویرانہ پسندی منہوم
تو مرا گھر بھی ہو ویرانہ تفرج گہہ بوم کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پُست معلوم
دشت میں ہو مجھے وہ عیش کہ گھریا دہنیں

کیوں کہی غم، کبھی دلی کبھی دن ہو کبھی شب انقلابا یہ ہرگز نہیں بے وجہ و سبب
غور سے دیکھ کے ہر بات کا سمجھو مطلب ابنِ ہنیش کو ہو طوفانِ حوادثِ مکتب
لطمہ موجِ کم از سیلی اُستادہنیں

میں تو چپ ہو کہ نہ ہو جا کہیں وہ رُسا وہ سمجھتا ہو کہ یارا نہیں دم لینے کا،
مٹ گئی آہ اُمیدِ صلہ صبر و رضا دے محرومی تسلیم و بداحساں وفا
جانتا ہے کہ مجھے طاقتِ فریادہنیں

چھہیں بادہ ہوساتی ہو کہ مطرب کہ لے باتیں ہی باتیں ہیں رنگِ چمنِ نشہ مے
کون کتا ہو کہ موجود یہاں ہو کوئی شے رنگِ تکیں گلِ لالہ پر شاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرورہ گزر باد نہیں

قصِ وقید کے آتے نہیں اُس کو آئیں نہ کوئی بارغ میں بیٹھا ہو برائے تعلقیں
شکرِ کربوے گلستاں ہے کچھ تو تسکین سبدِ گل کے تلے بند کرے ہو گل چیں
مردہ لے مرغ کہ گلزار میں صیا د نہیں

ہاتھ ہر چند تنائے دلی سے دہویا لیکن انکار سے بھی خوش ہو دہن کا جو یا
یعنی کچھ بات تو کی، دہم تو دل سے نکویا نفی سے کرتی ہو اثبات تراوش گویا
دی ہو جائے دہن اُس کو دم ایسا د نہیں

مانتا ہوں کہ کہاں خلدِ بریں کی ہر خشت جلوہ دارِ حرم و صومہ و دیر و کنشت
پھر بھی انصاف کی یہ بات ہو لے حورِ شربت کم نہیں جلوہ گری میں تے کو چے سو بہشت
یہی نقش ہے دے اس قدر آباد نہیں

واقعی بے وطنی بھی ہے مصیبتِ غالب پوچھو مانی سے مگر اس کی حقیقت غالب
لاکھ رحمت ہو، سفرِ پھر ہو غنیمتِ غالب کرتے کس منہ سے ہو غربت کی ٹسکتا غالب

تم کو بے مہری یا ایرانِ وطن یاد نہیں

۶۴۔ چار بیت

جون ۱۹۲۲ء

لحنتِ دل کب تک سنبھالے جائیں گے
اشکِ خوں آخر ہمالے جائیں گے

سانس گنتے عمر ہوتی ہے تمام	ہو رہا ہو خوابِ غور مجھ پر حسام
دل سے کتبِ لوگے تم کو زنداںِ کام	آہ کب ایرانِ نکالے جائیں گے
ترکِ اُلفت ہم سے ہو کیسے کیسے	اپنی قسمت ہو کہ رنج و غم سہیں
حال یہ ہے، لاکھ ہم روٹھے رہیں	جب وہ آئیں گے منالے جائیں گے
ہو رہا ہے یونہی اک عالمِ تباہ	سرگیں پھر کریں ہوئی چشمِ سیاہ
کچھ سنوں میں بھی تو اسے جاؤنگاہ	ڈورے کس کے دل پڑا لے جائیں گے
اُسے ہو کس کے مٹانے کے لئے	نقشِ حسرت، ہوں زمانے کے لئے
سرمۂ عبرت بنانے کے لئے	میری خاک اہلِ وفا لے جائیں گے

چونک اٹھے نہ یاد کی آواز سے باہر آئے خواب گاہِ ناز سے
پوچھتے ہیں مانی جاں باز سے کیا فلک پر بھی یہ نالے جائیں گے

۶۵- غزل

جولائی ۱۹۲۲ء

نہ نفس ہی نظر آتا ہے نہ صیاد مجھے کھینچ لائی ہو کہاں طاقتِ فریاد مجھے
کچھ نہ جزید ملی روزِ جزا داد مجھے اُن کو دیکھا کہ ستم ہی نہ رہے یاد مجھے
اے وہ پتھر سہی، نو لاد سہی اُن کا دل کہنے دی ہو تو ذرا ہجر کی روداد مجھے
حاصلِ ناصیہ سائی کے معلوم نہیں سر اٹھانے بھی تو دے لذتِ بیداد مجھے
کل گیا مردِ خدا توڑ کے زنجیرِ محباز آج پھر تیرا ملا مانی آزاد مجھے

۶۶- غزل

جنوری ۱۹۲۳ء

غم ہوا دل سے نہ جاناں کے ستم سے پیدا
دل کی ہستی ہی ازل میں ہوئی غم سے پیدا

قول میں آپ نے جو بات نہ باقی رکھی ،
 پھر وہ کی جاتی ہے کیوں آج قسم سے پیدا
 دیکھنے والوں نے کیا کیا نہ تراشی تہمت
 کتنے طوفان ہوئے اک دیدہ نم سے پیدا
 گر گئے کچھ مرے پیما نہ دل سے قطرے
 انکشافات ہوئے ساغر جسم پیدا
 شدنی کیا ہے ، خدا جانے ، مگر دل کا آل
 ہے ترے عیش میں نہاں ، مرے غم سے پیدا
 ہم نہ تھے جب تو یہ تھی روح کے پرے میں نہاں
 ہوئے پیدا تو محبت ہوئی ، ہم سے پیدا
 پوچھے مانی سے کوئی طرفگی شان ستم ،
 اضطراب اُس نے کیا دل میں کہم سے پیدا

۶۷۔ غزل

جون ۱۹۲۳ء

کسے دعوے کہ جوشِ اشکِ خونیں سیلِ دریا ہے
 یہ عالم ہے کہ اب دو آنسوؤں کا بھی تو رونا ہے
 سمجھتا ہوں کہ یہ اُس شوخ کا حُسنِ تھا صفا ہے
 یہ لوجانِ خریں نذرِ نگاہِ بے محاسبہ ہے
 نہ تھا یوں مبتلا ہونے کا خطرہ جان سے پہلے
 نہ یہ معلوم آگے چل کے دل کا کیا ارادہ ہے
 نہیں ہے جو مرے قابو میں، وہ ہے مدِ عادل کا
 نہیں جو بات میرے بس کی، وہ میری تناسل ہے
 محبت ہے، محبت میں کہاں دل سوزاؤ مانی
 مصیبت ہے، مصیبت کی گٹھری میں کن کس کا ہر

۶۸۔ غزل

جولائی ۱۹۲۳ء

تا صبح انتظار ہے اُن کا تو ہم نہیں منت کش سحر کبھی شامِ الم نہیں
 اجاب کو خوشی ہو کہ اب مجھ کو غم نہیں روتے ہیں کہ دل ہی تیرا پالم نہیں
 مقصودِ نالہ خواہش ترکِ ستم نہیں، تیری قسم نہیں ہے خدا کی قسم نہیں
 وہ وقت نزع آئے، مگر آخر آئے تو ہو ایک دم کا عیش تو کیا منتقم نہیں

مائی، وہ خوش جفا سے میں نادم اک آہ پر
 حالانکہ عرضِ حالِ محبت ستم نہیں

۶۹۔ قوسِ قزح

جولائی ۱۹۲۳ء

رنگ بارش نے جار کھا ہے اپنا دور دور
 بڑھ رہا ہے آنکھ میں سبزے کے قطارے سے نور
 میں یہ کہتا ہوں کہ آخر مے گاری کیا ضرور

کم نہیں برسات کی ٹھنڈی ہواؤں میں سرور
 اندر میں عالم پئے جامِ شرابِ ارغواں
 بادِ خوارمی کے شود منت کشِ پیرِ معاں
 ابرِ غم کو لے اڑی دل سے ہوا برسات کی
 انبساطِ دلِ بنیِ مستحریٰ فضا برسات کی
 توں میں پیدا ہے شانِ دلِ رُبا برسات کی
 یا فلک پر ثبت ہے بانگی ادا برسات کی
 یا مجھے خوش دیکھ کر مشقِ ستم کا جوش ہے
 اور یہ چرخِ جہا پر ورکماں بردوش ہے
 دیکھ کر کلِ شام سے برسات کا جوشِ بہار
 چھپ گیا تھا ابر کے پرے میں چرخِ زنگار
 منہ نہ دھویا ہے فضا کے آسمانی کا غبار
 تب ہوا یوں جلوہ گرِ مشرق کا زیرِ تاجِ دار
 یونہی کیا اکلیلِ الماسی میں کم بختی دل کشی

اب تو ہالے سے دھنکے اور زینت بڑھ گئی
 میں یہ سمجھا جب مجھے قوس قزح آئی نطر
 چہرہ خورشید کی رنگینیاں میں جلوہ گر
 پھر اسے نیزنگی ان سلاک کا سمجھا اثر
 پھر خیال آیا کہ رنگیں مہفت قلم ہیں، مگر
 سات دریا مختلف رنگوں کے جب یک جا ہوئے
 کیوں نہیں یک دل یہاں قانونِ فطرت کیا ہوئے
 آسمان نے یہ نائش کی ہے گویا رنگ کی
 کیسی لڑیاں جمع کیں گل ہارنگار رنگ کی
 اب زمانے میں کہیں بستی رہے کیا رنگ کی
 ہے محیط قوس میں محدود و نیاز رنگ
 اس کو مافی شانِ بوقلمونی صنعت کہوں
 یا نگاریں حلقہ آئینہ قدرت کہوں

۱۰۴
۷۰۔ غزل
اگست ۱۹۲۲ء

پھر ایک دن تجھے اے برق میہاں تو کریں
مگر نیا کہیں تیار آشیاں تو کریں
یہ عمر ختم سہی، اور ایک عالم ہے
یہاں کا عہدِ محبت و وفا وہاں تو کریں
بیان ہو گا پھر اہل وفا کا افسانہ
ترسی جفاؤں سے آغازِ داستاں تو کریں
ہیں پسند نہیں شکوہ کا زخمِ ما کا
وگر نہ ہم کلمہ جو رِ آسماں تو کریں
ملا کے آنکھ نہیں روز آپ کہتے ہیں
جھکا کے آنکھ ذرا ایک بار ہاں تو کریں
عجیب ہے موت کی میعادِ انتظار میں طول
نہیں تو آرزوِ عمر جاوداں تو کریں

تمام برق کی تابندگی کا چرچا ہے
 کبھی یہ لوگ زرا ذکر آئیاں تو کریں
 یہ کوئی بات تھی، لیکن نہ ہو سکا ممکن
 کہ قیس کو کبھی ایسے کا سارباں تو کریں
 عیاں نہیں، کبھی لطف نہاں تو ہو مانی
 یقین نہ ہو تو محبت کا ہم گساں تو کریں

۱۔ غزل

ستمبر ۱۹۲۲ء

ہیں تجویٰ آشنائے از حیاتِ دل سے ہم
 دور دور اپنا سفینہ رکھتے ہیں ساحل سے ہم
 پہلے ہی اس دن کا رونما سن چکے ہیں دل سے ہم
 جب تلاطم کا تظارہ کرتے تھے ساحل سے ہم
 وہ بھی کیا دن تھے کہ جب دل کھول کر نالے کئے
 کھولتے ہیں اب تو آنکھیں بھی بڑی مشکل سے ہم

اپنی بربادی پہ رونا چاہئے ہم کو، مگر
 رنج ظالم کی سترت کا کریں کس دل سے ہم
 یادہ آکر تادمِ آخِ سرِ بالیں رہیں
 یا پھر اُس وقت آئیں جب نے لگیں غفل سے ہم
 زندگی سے موت تک ہے فاصلہ اک سالن کا

پھر بھی کیا معلوم کتنی دور میں منزل سے ہم
 ہر گھڑی، ہر لحظہ اے تانی نے انداز سے
 اک صدائے آرزو سننے ہیں سازِ دل سے ہم

۷۲۔ غزل

دسمبر ۱۹۲۴ء

وہ ہم پر یہ سمجھ کر اور بھی بیدار کرتے ہیں
 اسیرِ آشریاں گم کردہ کو آزاد کرتے ہیں
 تمہاری ہر نظر جو اک تلقا ضائع نہا تھی
 وہل میں جلوہ فرمایاں گاہوں میں ظلم اُن کے
 کہ ہم دادِ ستم دیتے ہیں جب یاد کرتے ہیں
 کرم کرتے ہیں یعنی اک نئی سیداد کرتے ہیں
 تمہیں اب یاد کیوں ہو گی، ہم کثرتِ یاد کرتے ہیں
 نہ اُن کو بھولتے ہیں ہم، نہ ان کو یاد کرتے ہیں

زمانہ چاہتا ہے نشر انجامِ محبت کا بگو لے اس لئے مٹی مری برباد کرتے ہیں
 نہ ہی پرواز کی طاقت نہ عادتِ فائدہ کیا ہو اگر آبِ حرم فراتے ہیں اب آزاد کرتے ہیں
 شکایت کس بنا پر ہو، گلہ کیا کیجئے مائی
 ستم یہ ہے کہ نادانستہ وہ بیدار کرتے ہیں

۳۷- غزل

دسمبر ۱۹۲۲ء

کب فغاں با اثر نہیں ہوتی	اور کچھ ہے، اگر نہیں ہوتی
غم سے مانوس اگر نہیں ہوتی	تو وہ روحِ بشر نہیں ہوتی
ہاں نفس کی فضا میں لے صیاد	ہوسِ بال و پر نہیں ہوتی
آہ بن جاتی ہے نشیمنِ سوز	برق جب بسلوہ گر نہیں ہوتی
جیسا روشن تر اُتسُم ہے	ایسی روشن سحر نہیں ہوتی
دونوں اتوں میں عیشِ غم کی مجھے	آرزوئے سحر نہیں ہوتی
اور کیسے ہو اب محبت ترک	چاہتا ہوں، مگر نہیں ہوتی
جب وہ بالیں پہ ہیں اب دُنیا	کیوں ادھر کی ادھر نہیں ہوتی

روتے کھٹتی تھی زندگی مانی
اب تو یوں بھی بسر نہیں ہوتی

۴- غزل

جنوری ۱۹۲۵ء

سُنتے تھے کچھ تو کہتے تھے کچھ اپنے جی سے ہم
پہلے تو ایسے تنگ نہ تھے بے کسی سے ہم
ہم کو غرض بہار و خزاں سے نہیں، مگر
محروم کیوں ہوں لذت دیوانگی سے ہم
اک سیدھی راہ دل سے ملی تار گِ گل
اے خضر بے نیاز ہیں اب رہبری سے ہم
کیا جاؤ تم ہمیں، تمہیں ہم کیا سمجھ سکیں
نا آشنا مال سے تم ہو، خوشی سے ہم
مشکل سے عہدِ یاس میں کھینچی ہے ایک سانس
ہیں صرف یادِ عہدِ تمنا ابھی سے ہم

خود دار آپ یوں ہیں کہ رسوا نہ ہوں مگر
 مجبور ہو نہ جائیں کہیں بے خودی سے ہم
 تم اور ہم ہیں رونقِ دینائے حُسن و عشق
 تم اپنے اقتدار سے بے چارگی سے ہم
 ناچار جیسے موت سے ہیں، بس اسی طرح
 مجبور ہیں ہماریں دیوانگی سے ہم
 ٹھوکر تو سرِ فرازیِ عشاق ہے مگر
 ڈرتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے ناخوشی سے ہم
 تابِ نظر کسے کہ سُنی ہے جو اک صدا
 ہیں سرِ برآستانِ پریشِ اُسی سے ہم
 جو دوستی کے رشتہ نازک سے خوف ہو
 مانی وہ خوف رکھتے نہیں دشمنی سے ہم

۵۔ غزل

مارچ ۱۹۲۵ء

وہ جلوہ گرہیں پھر بھی ہے گلہ نہیں حجاب کا
 کہ تابشِ جمال کام دیتی ہے نقاب کا
 وہاں تو ہر اداس مصلحت ہے، اور ہم کو ہر
 سرورِ اتفاقات کا، ملال اجنباب کا
 سکونِ دائمی کا انتظار ہے ہمیں زندگی
 صلہ ملے گا یعنی ہم کو دل کے اضطراب کا
 تری نگاہِ لطف کے سوا اگر کچھ اور ہے
 تو خلد میں بھی سامنا رہا اسی عذاب کا

۶۔ غزل

مارچ ۱۹۲۵ء

تجھے اسے قیس، اک جلوہ نظر آتا تو بنے دل میں
 پھر اب کیا بحث، یلے گھر میں بیٹھی ہو کہ محل میں

محبت بھی ہے، مرگ ناگماں کا شوق بھی دل میں
 زرا دیکھو ہماری محویت، تحصیلِ حاصل میں
 الہی مشکلیں آسان کر اُس ذات کا صدقہ
 زباں پر میری جس کا نام آجاتا ہے مشکل میں
 کہیں پھینکو مجھے اُلفت میں، جب میں امن کھو بیٹھا
 وہی منجدِ معارف کی موجوں میں ہو جو خاکِ ساحل میں
 ادائیں اُن کی سب قاتل نہیں، ایسی بھی دیکھی ہیں
 کہ پیدا روح میں بالیدگی ہو، تازگی دل میں
 یہ طہرِ ترکِ الفت، گوشہ گیرِ ناامیدی پر
 نہیں، یوں چکیاں لیتے نہیں دُکھتے ہوئے دل میں
 مری ہر سانس گویا ایک گامِ سعی ہے، مانی،
 یہ میں جیتا نہیں، مصروف ہو قطعِ منازل میں

۷۷۔ غزل

اپریل ۱۹۲۵ء

دُنیٰ کا غم دیا، دلِ غم آشنا دیا قسمت نے یہ دیا ہو مجھے تم نے کیا دیا
بس اب نہ کہئے آہ نے دل کو ہلا دیا سمجھائیں آپ نے مجھے درسِ وفا دیا
یہ جان کر کہ صبر سے ہو میرا دل کو لاگ مجھ کو فریبِ عدہ صبر آزما دیا
جب ان ترانجِ عشقِ وفا سے ازل کے دن کچھ بھی نہ بن سکا تو مرادِ بنا دیا

تقدیر نارسا تھی تو اے قاسمِ ازل
مافی کو کیوں نہ اک دل بے مدعا دیا

۷۸۔ غزل

دسمبر ۱۹۲۵ء

نہ پوچھ اے نوا سیراب مجھ سے آثارِ بہاراں کو
ہوئی مدت کہ روٹیٹھا نشیمن کو ہکلتاں کو
نہ فرماتے اگر مجھ سے درِ بے الطافِ پنہاں کو
تو میں نعمت سمجھتا آپ کے جو بنیاں کو

خزاں میں چاہئے پیوند دامن بہاراں کو
 جنوں نے پھاڑ ڈالا وقت پہلے گریباں کو
 اہم ہے عالم امکاں کی ہر اونے سے اونے شے
 دُعا دیتا ہے زنداں میں میر جاگِ اماں کو
 سنا ہے جسے نام انسانیت کا جستجو میں ہوں
 وہ دُنیا کس طرف کو ہے، جہاں پا جاؤ انساں کو
 کہیں تو کون مانے گا کہ استغفار الفت نے
 ہمارے سامنے ٹھکرا دیا ملکِ سلیمان کو
 تمیزِ فقر و دولت اک جنونِ ہوشیاری ہے
 ملا دیتی ہے ہنسا رسی جنوں کی جیبِ اماں کو
 نہیں جب ضامنِ الفت نگاہِ اولیں تیری
 تو میں بھی رو نہ کروں عورتِ تجدیدِ ایماں کو
 یہی تو اک سہارا ہے مرا صبحِ قیامت تک
 مری بالیں پہ جلنے دو چراغِ شامِ حیراں کو

چلا میں، تم نہ آئے، آ، وہ ساعت کہ جب مجھ پر

تمنا تنگ کر دے عرصہ گورِ غریباں کو
سُلمِ حجرہ زنداں کی آرائش مگر مانی،
ہٹا دے نقشہ آزادی و سیرِ بیاباں کو

۷۹۔ غزل

مارچ ۱۹۲۶ء

شوق دیکھو، خنجرِ قاتل جو عریاں ہو گیا	روح بن کر دلِ بگ گردن میں پہناں ہو گیا
جذبہ دیوانگی زیبِ گلستان ہو گیا	یا جنوں کا جوشِ مہمونِ بہاراں ہو گیا
ہر نفس ہے سخی آزادی میں اک دامِ اُمید	میں تو تھا ہی دل بھی یوں باندِ زنداں ہو گیا
کیا بہا آئے گی اب میں نے تو دیکھا ہے کہ	آشیاں میراٹا، گلزار ویراں، ہو گیا
آزادِ کس مقصودِ میر بھی ہو، کیوں کل فرہوں میں	اور جو میں کل فرہوں تو کیسے مسلمان ہو گیا
ہاں، محبتِ ازہو، کتنا اہم، کیا عظیم	یہ کمالِ تیر پہناں ہے کہ عریاں، ہو گیا
دیکھ آئینہ ہو تیرے اقتدارِ حسن کا،	وہ زمیں جس کا لقب گورِ غریباں ہو گیا
جلوتِ تصویر ہو یا خلوتِ تخیل ہو	تو جب آیا اور جہاں آیا چراغاں ہو گیا

اول اول اک گد دل میری رہی تھی اب عالم ہو کہ دل سارا رگِ جان ہو گیا
اک غلش کی آرزو تھی جو مردل بن گئی ایک غنہ ابنِ تعارف تھا کہ پیکاں ہو گیا

پردہ دل میں تھا اسے مانی نہاں راز و جود

موت کیا آئی کہ اب وہ رازِ عریاں ہو گیا

۸۰۔ غزل

پایہ ۱۹۲۶ء

سہل نہیں کہ ہوشمارِ خلوتیاں راز میں

زندگیاں گزر گئیں بے کسیِ نیاز میں

اُن کے قدم کو جنبشیں ہوں گی حیرم ناز میں

قوتِ جذبِ التفات ہے جو سرِ نیاز میں

عشق گدائےِ حق ہے، حق کو اس کی احتیاج

کیا ہو اگر گدائے ہو کوئے گداؤںِ ناز میں

خوب ہوا تم آگئے، آہ جگر گدازِ ختم

صرف کروں گا ایک سانسِ ناکہِ جانِ ناز میں

عشق نے کس کی جان کی نذرِ وفا سے کوہ کن
 کس کو بنا دیا غلامِ بارگاہِ ایا میں
 مجھ سے محبت آپ کی چھپنے لگی کہ فرق ہو
 نالہ حق نواز اور ضبطِ زمانہ ساز میں

بانیِ سادہ دل نہیں فرق شناس کفر و دین
 سمجھا ہے کعبہ یقین بت کدہٗ محباز میں

۸۱- غزل

اپریل ۱۹۲۶ء

وہ ابھی ڈرتے ہیں ذکرِ نالہ شب گیر سے
 کیونکہ نادِ واقف ہیں ضبطِ آہ کی تاثیر سے
 تھی ہی وابستہ تباہی عشق کی تقدیر سے
 ورنہ میرے چارہ گر غافل نہ تھے تدبیر سے
 حسن یہ صورت بنا سکتا ہو اک انسان کی
 اُن کی قدرت بھی نمایاں، ہو مری تصویر سے

بات کل کی ہے کہ اک پیکاک دل زخمی ہوا
 آج سیری آرزو مجروح ہو اک تیر سے
 مسکرا نا آپ کا یوں رونق صبح اُمید
 شام غم کی جیسے زینت نالہ بشگیر سے
 سعی کی ناکامی پیسہ یہ عقد و کھلا
 لاگ ہے یعنی مری تقدیر کو تدبیر سے
 اپنے منہ سے کیا کہے آئی، مگر حق تو یہ ہے
 کم نہیں اس عہد میں وہ میرزا و میر سے
 ۸۲۔ غزل
 ستمبر ۱۹۲۶ء

مقبر جہاں ایک دن مجھ کو لایا ،
 وہیں سے ہوا آغاز عہد تنہا
 ملی تھی جہاں مجھ سے سیری جوانی
 وہیں ختم تھی دنیوی زندگی گانی

یہ صیاد ذکر بہاراں جو چھڑا بڑی دل نوازی، بڑی مہربانی
 مگر اب یہاں دل بہلنے لگا تھا نہ تھی یاد مجھ کو چمن آشیانی
 کہوں میں بہت کچھ، مگر فائدہ کیا، اگر آپ واقف نہ ہوتے تو کہتا
 جو آپ کے عیش و عشرت کا قصا وہی کی وہی سیسہ ہی غم کی کہانی
 مسلم آثار تھے عاشقی کے وہ اسے بے وفا تو نے باطل دکھائے
 گلا تجھ سے کیا ہو، دعا ہے خدا سے کہ یارب مجھے موت دے ناگہانی
 مبارک ہو اسے طالب دید موسیٰ ضرور آپ کو آج دیدار ہوگا
 یہ ہونا ز، یعنی نوازش کا وعدہ سمجھے ذرا معنیٰ لن ترانی
 یہاں تک بڑھی آپ کی بے وفائی کہ ڈالی مرے سرو بلائے جدائی
 مگر خیر، جب یہ قیامت بھی آئی تو اب رہ گئی کیا مصیبت اٹھانی
 سناؤں کہ آہ غم کا فنا ادھر کا ادھر ہو گیا ہے زمانا
 ہے فرصت اگر اور ہو ظلم ڈھانا غنیمت سمجھے کہ دزدہ ہے مانی

صبح غزل، اور یہ خوش بیانی

زہے طبع موزوں کا حسن روانی

اب اک نظم سادہ کی صورت میں آئی
دلِ زار کی کیجئے ترجمانی

بقا صرف ذاتِ خدا کو ہے لیکن حقیقت میں دل بھی نہیں خرد فانی
کہ ہے نامِ دل اب بھی عالم میں باقی قیامت ہی تھا ورنہ سوزِ سنائی
محبت ہے اک عالمِ نامرادی کہ قائم ہے نامحشر کا مرانی
یہاں ہر نفس کو ششِ رازداری یہاں ہر قدم در پئے رازدانی
سراسر غلط ہے اسے ظلم کہنا، نہیں رحمِ تقدیر کا یہ تو کیا ہے
کہ اک آشتیاں سوختہ کے قفس پر گوارا نہیں اس کو بجلی گرائی
کہاں تک وجوہِ خیالی ہمارا پیچھے گا تہ دامنِ رختِ ہستی
اسے ایک دن چاک ہونا ہے آخر عیاں ہو کے رہنا ہے رازِ نہانی
زرا فطرتِ حسن رکھے نظر میں رہے شعلِ عرضِ متن کا موسے
تقاضائے تکرارِ مطلب سمجھئے اگر التجا پر کہیں لن ترانی
مرے آشیانے کو ویران کر کے غنیمت بتاتا ہے جینا قفس کا
اُٹی کچھ ایسا ہو صیاد جس سے سمجھ لے کہ کیا چیز ہے زندگانی

غزل تو نے مانی یہ ایسی ٹیٹی جی ہے
 جسے سُن کے دیوار و درو جہیں ہے
 کچھ اب قافیے میں جوانی کے بھی کہہ
 کہ ہے یہ زمان و دارِ جوانی

جوانی ہر اناں پر آتی ہے لیکن کہیں جنسِ ارضی کہیں آسمانی
 جوانی مری جاہلِ کشتِ ہستی کہ ہے چشمِ براہِ برقِ جوانی
 مسرت کی راحت کا اب ذکر ہی کیا الم ہے ہوا میں بھی لذت نہیں ہے
 اسی سے میں کمِ بخت یہ چاہتا تھا کہ جب موت آئے تو جائے جوانی
 دلِ زار ہے اور آفتِ پُر آفت کہاں ہے خدا اور تختِ عدالت
 جوانی خود اپنی جگہ اک قیامت پھر اُس پر قیامتِ حسیں کی جوانی
 یہی شانِ ہوا کی روزِ خزا بھی کہ ٹھہرے تباہی مری حقِ بجا ب
 مجھے جس جوانی نے دینا سے کھویا اتنی رہے حشر تک وہ جوانی

فراغ اب اگر ہو بھی مانی تو کیا ہے
 نفس ہو نشیمیں سب ایک سے ہیں

خزاں آگئی گلشنِ زندگی میں

چلی جا رہی ہے ہمارے جوانی

۸۳۔ غزل

نومبر ۱۹۲۶ء

وہی وہ، وہی بزم، کیسے کہوں میں،
کہ جو کل تھا وہ رنگِ محفل نہیں ہے

یہ کہئے کہ سر میں وہ سودا نہیں ہے
یہ کہئے کہ پہلو میں وہ دل نہیں ہے

اسے طاقتِ ضبط کا ادعا ہے
وہ جلوے کی تابش کا قائل نہیں ہے

غرض، ہوش اس گفتگو کا ہے سب کو
کہ وہ زینتِ آرائے محفل نہیں ہے

ہے لیلے تو محفل میں موجود، لیکن
جلو میں صدائے سلسل نہیں ہے

نہیں ہے جو دیوانہ نخبہ باقی

تو وہ شانِ دچپ محل نہیں ہے

کرے سعی ہر چند سارا دانا

میں دل کی قسمت میں آرام پانا

محالات سے ہے لکھے کامٹانا

یہ کھ لو کہ ہاں تم کو مشکل نہیں ہے

کٹے کیے ہستی کی راہ مصیبت

کہ ہے ہر قدم کارزارِ محبت

یہ مانا کہ انفاس کی کچھ حقیقت

بجز سعی قطع منازل نہیں ہے

یہ محشر کا مجمع ہے میں چپ ہوں لیکن

خود انصاف سے آپساک بات کہہ دیں

کوئی ذرہ کائنات جہاں ہے

کہ تصدیقِ بربادی دل نہیں ہے؟

اب آنکھوں میں آنسو، نہ ہونٹوں پہ نالے
 نہ ایذا کے حسرت نہ کربِ تمنا

فقط جذبہ جاں نثاری ہے اور بس
 کوئی شاہد ہستی دل نہیں ہے

کجاناگساں جل کے نابود ہوتا
 کجا برق سوزاں کا طوفِ نشیمن

لرزتا ہوں بیٹھا ہوا اشیاء میں
 بلاسی بلا ہے جو نازل نہیں ہے

مرے بس میں دل ہے نہ دل کی تمنا
 مگر تم کو قدرت ہے، پامال کر دو

یہ سچ ہے کہ میرا دل بے حقیقت
 تمہاری تمنا کے قابل نہیں ہے

نہ پوچھو کہاں کا ہے قصد اور کیوں ہو
 سکوں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں سلسل

بظاہر سو موت جانا ہے، لیکن

سنا ہے کہ وہ بھی تو منزل نہیں ہے

جہاں محو ظاہر پستی ہے مانی

تو کچھ اہل دل ساتھ، لیکن بچے بھی

در اجوش تائید حق کا نہیں ہے

زرا جراتِ ردِ باطل نہیں ہے

۸۴۔ غزل

نومبر ۱۹۲۶ء

داد خواہی کا مجھے حشر میں کیا ہوش نہ تھا کیا کروں میں کہ مراد وعدہ فراموش نہ تھا
تھا وہ ناکام جسے ہوش میں دیکھا یعنی جس نے دیکھی تھی جھلکتی سی اسے ہوش نہ تھا
یلی دقیس کی تقدیر تھی شہرت، ورنہ وہ ستم کیش نہ تھا، یا میں فاکوش نہ تھا
عشق، اور طاقبِ دیدار، مگر اے موسیٰ قبل اظہار تمنا بھی تجھ میں ہوش نہ تھا

آج کچھ بادہ دوشینہ میسر آئی

نکل جو میخانے میں مانی بلا نوش نہ تھا

۸۵- غزل

اپریل ۱۹۲۶ء

بجلی مضطرب کہ ٹوٹے کسی کاشانے پر
کشمکش مجنون کو مجنون ہی کہتی دُنیَا
تہمتِ عشق لگا دیتے ہیں دیوانے پر
دم کا اکٹھوس نکلتا، ترے آجانے پر
شدتِ آرزو دید کا دیتا ہے ثبوت
برق ٹوٹی نہیں اہل وطنِ خوش کہ ابھی
برق ٹوٹی نہیں اُڑے ہوئے کاشانے پر
شب کو آنسو نکل آئے تھے جس فنانے پر
اب میں بلباشِ یس کر کہ وہ قصہ تمام
پھر یہ جی میں ہو کہ بنیادِ شمع کھ دوں
پھر کروں برق کو مجبورِ ٹرپ جانے پر

داغِ بربادیِ حسرت کا ہو دل میں مانی
دیکھ لو شمع نہ دیکھی ہو جو ویرانے پر

۸۶- غزل

جون ۱۹۲۶ء

ختم ہو سرِ شرمِ جہا ہو میری حالت دیکھ کر
یہ اتنا سفاک تنگی وقتِ عیادت دیکھ کر

حُسنِ جادوِ نوح کر بھی میں آخر مٹ گیا بے وفا کا حُسنِ اظہارِ محبت دیکھ کر
 اب آئے ہو تو ٹھہرو جی، چلے جانا بھی انتہائے آرزو، انجامِ اُلفت دیکھ کر
 شکر ہے مجھ سے بھی البتہ ہر کچھ اُن کی خوشی یعنی میں لیتے ہیں وہ میری مصیبت دیکھ کر
 دے دیا فطرتِ دل کو آج اُذنِ بخودی ہشیاری کو خلافتِ شانِ اُلفت دیکھ کر
 ایک ہی نظر کہاں تک، بند کر لی ہیں آنکھ زندگی، یعنی یہ تہیدِ قیامت دیکھ کر

دوسو سوں سے اور بھی مانی کا دل ہو بے قرار

اے وفا دشمن، تری چشمِ مروت دیکھ کر

۸۷۔ غزل

فروری ۱۹۲۸ء

وہ بھی ہیں جنہیں عشق سے کچھ کام نہیں ہو فطرت کا یہ انعام مگر عام نہیں ہو
 تسکین کا محبت میں کہیں نام نہیں ہے آسودہ نہیں وہ بھی جو ناکام نہیں ہو
 بے دردیِ دل، اور پرستاریِ معبود وہ کفر نہیں ہے تو یہ اسلام نہیں ہو
 بجلی تو نشیمن پہ نہ گرتے ہوئے دیکھی یہ تو ہے نفس میں اگر آرام نہیں ہو
 آرام سکوں میں ہو، سکونِ موت میں یعنی جینے میں تو ظاہر ہو کہ آرام نہیں ہو

نظارے سیا او بھی دل ہوتا ہے مضطرب
 بے آپ کے دیکھنے بھی تو آرام نہیں ہے
 وعدہ نہ رہا یاد تو مجھ کو بھی بھلا دو
 اب میرے مقدس کوئی شام نہیں ہے
 ہر میری محبت ہی تری نازشِ خوبی
 مستغنی آغاز یہ انجام نہیں ہے
 مانی نہ ہو محرمِ غم عشقِ الہی

پچا رہے حریفِ غم ایام نہیں ہے

۸۸۔ غزل

مارچ ۱۹۲۰ء

غرابتِ یاس میں کہاں اب وہ جنوںِ زندگی
 مضطربانِ آرزو، یہ ہے سکونِ زندگی

قصہ تمام کر دیا موت نے وہمِ زلیست کا
 جزوِ فنا نہ تھا تھا ہی سنو، زندگی

وصل میں ہو سکونِ دل، ہو یہ اسیدِ مضطرب
 جب کہ ہر عشقِ مستقل درِ دوروںِ زندگی

جس کی ہر ایک سانس ہے جانِ ہزارِ مضطرب

یاس کا وہ طلسم ہے عہدِ سکونِ زندگی
 ناخوش اُسے کریں تو کیوں نیست کی نامردیاں
 جس کی جبین پہ لکھ گیا ”صیدِ زبونِ زندگی“
 پھر کبھی دیکھئے گا آپ حسنِ بہارِ آرزو

شوخی رنگ ہوا بھی تشنہِ خونِ زندگی
 دیکھئے نقشِ غامہِ مآنی با کمال کے
 پیشِ نظر ہے منظرِ بوسلِونِ زندگی

۸۹ - غزل

اپریل ۱۹۲۸ء

ہوئی ہے چارہ سازیِ منحصر و پیدارِ جاناں پر
 مشیتِ ہنس رہی ہوِ ہمتِ بیسارِ ہجراں پر
 یہ عالم ہے پرِ دہالی کا، یہ پرِ دازکی ہمت
 قفسِ کو لے کے جا بیٹھا ہوں یو اِ رگلتاں پر
 میں شایانِ ملامت تھا، مگر دعا عطا قیامت میں

غورِ اتقا کو رشک کیوں ہو شرمِ عصیاں پر

مری اک سانس پر ہے منحصر ہنگامہ ہستی

بیاہاں گردشوں میں ہو سرِ خارِ مغیلاں پر

کرمِ اے عشق پیدا ہو چلا ہے سرمدی نعمت

ابد تک نہ ختم زن رہنایو نہی تارِ رگِ جلاں پر

زلخا عصمت دیوانگی تیری مُسلم ہے

کہ ہے پیوندِ دامنِ نبی چاکِ گریباں پر

ہو خاکِ خوب اے مانی، مگر بس جان پڑ جاتی

جنوں کا رنگ چڑھ سکتا جو تصویرِ بیاہاں پر

۴۰۔ غزل

اگست ۱۹۲۸ء

کی موت نے پیدا اک تسکین کی صورت کی

ملنی تھی جسند آخر، آلامِ محبت کی

کٹتیں ہی نہیں گھڑیاں، اُف روزِ قیامت کی

تبیر کہاں نکلی، خواب شبِ فرقت کی
 اللہ کوئی حد ہے اس دردِ محبت کی
 تسکین جسے نختے، اُمیدِ قیامت کی
 اس یاس کے عالم میں، وہ آئیں کہ بوت آئے
 اب دلیں ہے گنجائش صرف ایک شر کی
 ہر رنگِ قیامت ہے انجسامِ تنہا کا
 حسرت تھی بہت مجھ کو ظالم کی عنایت کی
 آئینہ ہی، ہم تم ہیں، لوشانِ ملاو اب
 بے رنگیِ فطرت سے، نیزنگیِ فطرت کی
 میں تمنع میں ہوں اور وہ مصروفِ خود آرائی
 اے حسرتِ نظارہ سب باتیں ہیں فصاحت کی
 اب دید کہاں ہوگی، دنیا میں کہ عشر میں
 مدت تو بتاتا جا ظالم غمِ فرقت کی
 پہنچو گاہیں ہیں بھی، ہر خند کہ لے مانی

تو کبچے چلا، میں نے بُٹ خانے کی نیت کی

۹۱- غزل

اگست ۱۹۲۸ء

وہ خود آج آمادہ استحاں ہے مگر آسماں سے بھی اب بدگماں ہے
جلدائی میں ویران سارا جہاں ہے زمیں پر بس اب میں ہوں آسماں ہے
مری فہم کو تیری باتیں خموشی، ترے وہم کو میری چُپے آسماں ہے
سمجھئے شہو واس کو یا غیب کہئے محبت عیاں ہے محبت نہاں ہے
غمِ برق و صیاد و گل چیں مُسلم، مگر کیا کروں، آئیاں آئیاں ہے
بس اب چُپ ہو صیاد میں ماننا ہوں قفس میں بھی گنجائش آئیاں ہے
الہی مجھے موت خاموش کر دے کہ پھر آج تاکیدِ ضبطِ فغاں ہے
بڑے حشر سے کون اک نزل آئے کہ جنت میں ہو اگر تو یہاں ہے

مگر تو بھی ننگِ محبت ہے مانی
کہ اب تک تجھے ہوشِ ضبطِ فغاں ہے

۹۲۔ غزل

ستمبر ۱۹۲۸ء

نہیں سنتے ہم، نہ سنیں، مگر ہے صدا تو پردہ سازیں
 نہیں دیکھتے نہ سہی، مگر ہو اثر تو دل کے گدازیں
 وہی اک حقیقتِ عشق ہے، جسے حُسن کہئے مجازیں
 کہ کرشمے ناز کے دیکھے گا فقط جوابِ نیازیں
 ترے دشمن اور ترے دوست کے لئے قہر و لطف لئے ہوئے
 شوقِ رد و نعل ہے مصر میں تو شگافِ کعبہ حجازیں
 نہ تیرے کلفتِ عیش ہے نہ حسِ ملال و سرور ہے
 کہیں ایسی حالتِ دل کو کیا جو نہ سوزیں ہو نہ سازیں
 مجھے دیکھ لیجئے اک نظر میں یہ چاہتا ہوں کہ دیکھ لوں
 یہ وسیعِ زمانہ آپس کی چشمِ شہدہ باز میں
 میں وہ ہوں کہ مددِ عشق کو نہ رہی ضرورت رہ نا
 کہ ہیں میرے سجدہ بے خودی کے نقوشِ اہِ نیازیں

جو صنم بھی پوچھ تو دل سے پوچھ، یہ کیا ہے تانی بے یقین
نہ خلوص تیرے سجدہ میں، نہ رجوع تیری مناز میں

۹۳- غزل

اکتوبر ۱۹۲۵ء

قصہ و تصور، یعنی راہ طلب کے سبادی کچھ بھی نہیں
سرحد ہوش سے آگے بڑھ، یہ جذبِ ارادی کچھ بھی نہیں
اے گوشہ نشین یاس، اے دل، اے محو فریب آزادی
ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے بند و فاس، یہ تو آزادی کچھ بھی نہیں
راہِ غم اور قافلہٴ دل، کس کو خبر ہے منزل کی
شہرِ جیس، آوازِ حدی خواں، بانگِ منادی کچھ بھی نہیں
نا دیدہ سکونِ ساحل ہوں، مانوس بہ آغوشِ طوفاں
میں نابلدہ آزادی ہوں، میری بربادی کچھ بھی نہیں
ہستی کو عدم جس صورت میں حاصل ہو وہی پائندہ ہے
یعنی شکلِ ثباتِ خوشی، جذمِ گشتِ شادی کچھ بھی نہیں

دردِ نہاں ظاہر ہو تو کیونکر، آہ کی آوازیں سن کر،
 میں نے سوال کیا، کیا گزری، دل نے صدا دی کچھ بھی نہیں
 اب کیا پرسش ہو دل تڑپا، آنسو ٹپکے دیکھ اے مانی
 میری کہانی اس کے سوا جو تجھ کو سنا دی، کچھ بھی نہیں

۹۴- غزل

نومبر ۱۹۲۸ء

لایا ہے بامِ پرائیجس جذبہِ جواب کا افسانہ سن لیا ہو زلیخا کے خواب کا
 محشر میں کیا شمارِ جرائم سے مدعا یعنی حساب ہو کرم بے حساب کا
 بجلی گرے، اگر میں تغافل کہوں اسے تمکین، جواب صفا تو ہے منظر اب کا
 آباد عالموں کو قیامت مٹائے گی کیا حشر ہوگا اس دلِ خانہ خراب کا

یہ زندگی ہے ہست ناؤ فنا آل

مانی، نظر میں ہو مرے عالمِ سراپ کا

۹۵- غزل

دسمبر ۱۹۲۸ء

راگناں ظلم ترا، اوستم ایجا دہنیں یہ تھاں کیا ہو جٹاؤں کی اگر دہنیں
مجھ کو منظور کہ ہو شرم جنا عذر کر م یہ ستم کیسے اٹھاؤں گا کہ بیدار دہنیں
سائنس ہر سائنس ہو معمورہ صد حسرت دل کون کہتا ہو کہ راہ عدم آباد دہنیں
وعدہ کیوں مان نہ لو، فرصت ایفا ہی کہاں اب، کہ میں ترع میں ہوں، یہ کہو یا دہنیں
حاصل نہ کی عشق ہو اک درس فنا اور کچھ اور ملا ہو تو مجھے یاد دہنیں
تیری رحمت کہ رہی فطرت انسان آزاد میری ہمت کہ میں یا اس ہمہ آزاد دہنیں

جرات شکوہ ہے مانی تو شکایت باطل

جرات افزا جو ہو، وہ ناز ہو بیدار دہنیں

۹۶- غزل

جنوری ۱۹۲۹ء

جادہ پیائے تمنا اب بھی آجا ہوش میں
دیکھ پردانے کی نزل شعلے کے آغوش میں

دل سے کیا ممکن نہیں یوانگی کے جوش میں
 فصل گل قدموں میں، دل ہے اگر آغوش میں
 اک نظر تھی نقطہ آغاز و انجام حیات
 فکر فردا بھی ہر مہینہ محو یادِ دوش میں
 کون ہو پھر داخل ہنگامہ زارِ ہوش و عقل
 کون ہو مہوشی کی راحت پا کے آئے ہوش میں
 دیکھنا غفلت سمجھتے ہیں اسے عین خرد
 عقل ہو جاتی ہے جب گم، اعتبارِ ہوش میں
 کون جانے کیا ہے حدِ انتہائے بخود ہی
 ابتلائے بے خودی تھی انتہائے ہوش میں
 ہر لمحہ ناکام ہی فرما کہ تانی ہے ابھی،
 ایک ناوک، ترکش چرخ کہاں بردوش میں

۹۷۔ غزل

مارچ ۱۹۲۹ء

آسمانوں میں تو چکر بر سبیل وام ہے ورنہ جو کچھ ہو وہ میری گردش ایام ہے
میری بربادی، مے احسانِ غم کا کام ہے ہوش نے غارت کیا، دیوانگی بدنام ہے
جاں فزا، جاں سوز، دل کی موت، دل کی زندگی منظرِ ضداد ہے جس کا محبت نام ہے
زندگی ہر حال میں ہو ایک درِ مستقل اور دو اس کی محبت ہو، اگر ناکام ہے
وہم آغازِ خرابی سے تھی غم کی ابتدا انتہائے غم یقینِ خوبی انجام ہے
خوئے غم سے غم میں لذت، لذتوں میں زندگی کوئی کیا سمجھے کہ میری زندگی ناکام ہے

سبر کے خزمین پہ لے مانی جو یہ بھلی گرمی

اک بلا ہے جس کا اُسیدا یا پیارا نام ہے

۹۸۔ غزل

اپریل ۱۹۲۹ء

مراد م تو میری آنکھوں میں نظر کا ہم نشین ہے
یہ غلط کہ وقت آخر کوئی آرزو نہیں ہے

یہ ہے شانِ آستان کی کہ ہر سجدہ گاہِ عالم
یہ فضا کے دل کی دوست، کہ وہ آستان ہیں ہے

مراد و تم نے پوچھا، تو میں درو اب کہوں کیا
کہ حریفِ لطفِ پرستش مراد وہی نہیں ہے

ترہی جو نگاہِ اول، مری مبتدائے غم تھی
خبر اُس کی ہر جو سیری یہ نگاہِ واپس ہے

وہ ازل ہو یا ابد ہو، یہ جہیں ہے اور سجدہ
کہ فنا کا بابِ آخر، یہی درسِ اولیں ہے

یہ نہیں کہ میرے دل کو نہیں ذوقِ شکوہ سنجی
مرے ذہن میں گلے کی کوئی بات ہی نہیں ہے

مری زلیت کا مقدر تو ازل سے ہی مقرر
ترہی اک ادا پہ ٹٹنا، وہ ادا جہاں کہیں ہے

نہ جھکے اگر مرا سر، تو مری خطا ہے، ورنہ
یہ جو نقشِ پا ہے تیرا، یہی نقشِ ہر جہیں ہے

میں یہ رو رہا ہوں مانی، کہ نہ مل سکا وہ دامن
مرے آنسوؤں کی قسمت، یہی میری آیتیں ہیں

۹۹- غزل

اپریل ۱۹۲۹ء

نہ فقط یہ کہ میں اب درخویر محفل نہ رہا

یاس میں دل بھی تمناؤں کے قابل نہ رہا

اعتنا کا کبھی محتاج غم دل نہ رہا

نہ سنا گل نے تو کیا شورِ غنا دل نہ رہا

دل کا مقصود خدا جانے کہاں ہے، کیا ہے

کہیں اسودہ یہ سہریکا نہ منتر نہ رہا

جان بھی کیوں نہ فدا کئے کرم برق کروں

اب کہ اندیشہ برباد ہی حاصل نہ رہا

اٹھ سکے ہیں اٹھیں گے یہ حجاباتِ نظر

غش کا پردہ تو ہے، کچھ اور جو حامل نہ رہا

یہ مٹا اور مٹایاں اثرِ حسن ہوا
 تم کو آئینہ ملا، اور مراد دل نہ رہا
 لذتِ دردِ تنہا ہے فقط حاصلِ عشق،
 جب تنہا ہوئی حاصل، کوئی حاصل نہ رہا
 جد ہے رازِ بقا، سہی ہے تصدیقِ حیات
 زندگی کیا جو کوئی مطلبِ مشکل نہ رہا

اب جو شاعر ہے وہ ہم سرِ غالب مانی
 مجھ سا ناقص بھی تو کامل ہے کہ کامل نہ رہا

۱۰۰۔ خاکِ شعل

اگست ۱۹۲۹ء

آج پھر کیا چیز ہے سینے کے اندر شعل
 پھر خدا جانے کہاں سے آگیا پہلو میں دل
 میں آئے خاکِ پاتا ہی تھا دل کا نشان
 تجھ کو خاکِ شعل میں کیوں کر مل گئیں چٹکائیاں
 لے کے جن چٹکائیوں کو شعلہ سا ماں کر دیا
 داغِ روشن کر دیے کیسے چراغاں کر دیا

یا مجھے بیگانہ سوزِ محبت دیکھ کر، جوشِ غیرت میں غم و حس نے ڈالی نظر
 مشقِ تخلیق شرابے نثار کرنے لگا اس طرح اپنے اثر کا امتحاں کرنے لگا
 آگ پیدا کی شعاعِ عشوہ و انداز سے آگ میں بھڑکا دیے شعلے ہوا ناز سے
 یا یہ فطرتِ حسن کی ہے جو بروئے کار ہے جلوہ افروزی بشوقِ گرمی بازار ہے
 واقعی ذوقِ نالائش اقتضائے حسن ہے کس کو تاب یک نظر ہو، صیقلے حسن ہے
 برقِ پاشِ جلوہ کو اس کی زرا پڑا نہیں ہوش کھو بیٹھے کوئی یا آگ لگ جائے کہیں
 یا اینست ہے کہ دل آئینہ ہے تو آفتاب یوں تھی آغوشِ دل جلو سے تیر کا میاب
 کیوں نہیں تو حسن ہے تیری طہیت فیض ہے تیرا سرا یہ محبت تیری طہیت فیض ہے
 آئینہ کیا، جب نازش تیری آئے جوش میں تیرے پر تو سے ہوتا بشِ ذرہ رو پوش میں
 کوئی صورت بھی ہو، استعداد لازم ہے مگر جو ہر قابل ہو، تب ہوتی ہے ترتیب اثر
 آپ دنیاں ہے گہرا، لیکن صدف کے واسطے ہی مساوات مہر میں برج شرف کے واسطے
 کیا آگائے مینہ نہیں میں جب ہو زُندگی کیا جلائے برقِ اہمیت تو دیکھو خاک کی
 مجھ میں استعداد کیا ایسی ہلاکی بے حسی بے دلی میں یا س کے ہاتھوں بنا جس کی ٹہری
 تو نے اس عالم میں کیونکر سوز پیدا کر دیا دل تو خاکستر تھا، کیسے دل کو شعلہ کر دیا

سحر ہے، خیرِ قیامت ہو، یہ عجاظ ہے جس کی حامل اکیسویں ہی نگاہِ ناز ہے
 آسمانِ جن کی زہر ہو، وہ قدرت تھے نذرِ دیتا ہے فرشتہ ہر یہ اُلفت تھے
 تو لکائے آگ پانی میں کہ چھا جا دیوں تو جھکائے عصمتِ قدسی بابل کا کنواں
 آہ، تو اور مافیٰ ناکام کی بزمِ حیات کیا تھے جلو کو کم تھی یہ فضا کے کائنات

۱۰۱۔ غزل

ستمبر ۱۹۲۹ء

دمِ واپس ہے آخر، ترا انتظار کب تک
 رہے چشمِ منتظر میں مری جان زار کب تک
 یہ درست ہو کہ جلتا ہو چراغ بھی تو لیکن
 وہ سہرا کب تک، میں تیرا کب تک
 تری قدر میں میں ثابت، تری بے نیاز دوست
 کہ نیاز رہنے دیتا سہرا کب تک
 میں ہوا تباہ جلتا، ہے فروغِ حسن اتنا

یہ خزاں مگر کرے گی مدد بہار کب تک
یہ صلاح چارہ گر کی ہے کہ مرگ ناگہاں کا
کروں انتظار مانی، مگر انتظار کب تک

۱۰۲۔ غزل

اکتوبر ۱۹۲۹ء

اُن کا دن اُن کی رات ہے مانی اُن کی سب کائنات ہے مانی
زندگی اُن کے ہات ہے مانی میرے کیا بس کی بات ہے مانی
اُٹھ بھی جائیں جو اور سب پردے تو حجابِ صفات ہے مانی
اجرِ آلام روزگار ہے عشق عشق، یعنی نجات ہے مانی
میرے نقص، جو دے سے ثابت اُس کی تکمیل ذات ہے مانی
موت کو عہدِ غم میں ڈھونڈتے ہو موت بھی کیا حیات ہے مانی

دیکھوں ہوتی ہے کس جہاں میں سحر

میں ہوں اور غم کی رات ہو مانی

۱۰۳- غزل

نمبر ۱۹۲۹ء

ہوش کے امتحان سے دل ہی نہ باز آئے کیوں
 جلوہ حیرت آفریں طعنے شوق اٹھائے کیوں
 اک ازلی رفیق تھا، بیچ ہی نہ یاد آئے کیوں
 ماتم دل بجا، مگر، دل ہی تو مٹ نہ جائے کیوں
 تجھ سا کوئی حسیں نہیں، کوئی نہیں کہیں نہیں
 ورنہ تجھی تک آرزو، آخر کار آئے کیوں
 موت مالِ زلیست ہے، زلیستِ دل مراد ہے
 حاصلِ دل کہ درد ہے، جان کے ساتھ جائے کیوں
 اچھی بُری ہر آرزو دل کی، تری نظر میں ہے
 ایک کو دل دکھائے کیا، ایک کو دل چھپا کیوں
 وہ بھی تھی اُن کی مصلحت، یہ بھی اُنھیں کی خوشی
 عیش میں جب سرور تھا، غم میں ہائے کیوں

سمجھ دو کیا جو بے خبر لذت بندگی سے ہے

جن جبین سجدہ ریز، اُس کی نظریں آئے کیوں

عقبہ جلوہ گاہ ناز، خود ہے عبودیت طراز

دعوتِ سجدہ نیاز، اہل جبین کو آئے کیوں

تانی رند کچھ نہیں، صاحبِ دل نہ اہلِ دل

دیر ہو یا حرم، کہیں آئے تو آخر آئے کیوں

۱۰۴- غزل

نومبر ۱۹۲۹ء

دل کی فنا پہ غم کی فنا کا مدار ہے لیکن فناے دل کا کسے اعتبار ہے

عمر اب بھی ہو تو ترانہ شطار ہے آخر تو دل ہی، اور دل امیدوار ہے

یار بمر اجنوں ہو کر شمشہ بہار کا یا میرے ہی جنوں کا شکوہ بہار ہے

ہو صرف لذتِ الم عشقِ لہرِ نس کس کو یہاں سیر الم روزگار ہے

ہاں سچ ہو، ذمہ دارِ عمل ہو مرادِ جو د لیکن وجودِ حیر ہے یا اختیار ہے

اک شعبہ امید کا تھا اضطرابِ دل اعجازِ یاس یہ کہ گویا قرار ہے

معلوم ہو سبب تو بتاؤں سبب تمہیں اتنا ہی جانتا ہوں کہ دل بے قرار ہے
 انجام کا لقب نگہ واپس ہوا حالانکہ یہ وہی نگہ انتظار ہے
 باقی ہو اُن کا حُسن، تو کس کے لئے فنا
 ماتی، جہاں تو سب تیرا مان یا رہے

۱۰۵۔ غزل

دسمبر ۱۹۲۹ء

بچائے رکھتا ہے اسے صبر آبرو میری
 یہ اعتبار کہ ظالم ہے آرزو میری
 کہاں کہاں رہی آوارہ جستجو میری
 خبر نہ تھی کہ مراد دل ہے آرزو میری
 میں اپنے آپ کو کھو دوں تو کوئی بات نہیں
 کہ تیرے دل میں بھی پیدا ہو جستجو میری
 نہ ہی بتا دے کہ پھر شہر آرزو کیا ہے
 میں تیری بات نہ سمجھوں، اُس نے نہ تو میری

مری دفا سے خفا ہو تو یہ جفا کب ہے
 ستم تو یہ ہے کہ ٹھٹھتی نہیں یہ خمیری
 یہاں کے صبر کی آخر کہاں ملے گی جزا
 ارے یہ حشر ہے کچھ سُن لے دو بدو خمیری
 کھٹک ہوئی تھی زرا کم، کہ میں نے زخم جگر
 سیا، تو ٹوٹ رہی سوزنِ رفو خمیری
 وہ ہے زباں زدِ ہرزہ جہاں کیونکر
 ہوئی خیال میں تجھ سے جو گفتگو خمیری
 دل اُس نظر نے ٹھکانے لگا دیا مانی
 پناہ پا گئی آخر کو جب خمیری

۱۰۶۔ غزل

دسمبر ۱۹۲۹ء

سزنگوں چار طرف گنبدِ مینائی ہے
 واہ کیا حُسنِ تقاضائے جبینِ سائی ہے

میری حیرانیوں کی حوصلہ افزائی ہے
 سامنے میں ہوں، وہ مصروفِ غم و آرائی ہے
 ناشکیبا ترے جلوں کا تماشا ئی ہے
 کہ نظر، دشمنِ دعوائے شکیبائی ہے
 دل ہے پابندِ ادب، ورنہ کوئی بات نہ تھی
 ایک ہی سانس تو حدِ شبِ تنہائی ہے
 کب تھی، اور کس کی نگاہوں میں تھی شانِ جمال
 اے کہ بیگانہ الفت تری رعنائی ہے
 ہاں یہ سچ ہے، کوئی مجبور ہے، کوئی مختار
 ورنہ محبوب کا طالب ہے جو شیدائی ہے
 حیرتِ دل ہو کہ وارفتگی ہو شس کہ موت
 کچھ نہیں، دلولہ دارِ تماشا ئی ہے
 آتی ہے تیری ہی آواز، جدھر جاتا ہوں
 تو لے کی بات، تو ہر ذرے میں گویائی ہے

میں ہوں دیوانہ اسرارِ یسارے آئی
یہ تو سب دیکھ رہے ہیں، چمن آرائی ہے

۷۰۱۔ غزل

جنوری ۱۹۳۳ء

ہاں مری موت بھی اک نوبت حیرانی ہے
بند ہے آنکھ، کہ جلوں کی فراوانی ہے
چاہتی ہے کہ کرے غم کا مداوا غم سے
کس قدر عریبہ جو فطرت انسانی ہے
نفسِ اولِ الفت تھا ولیلِ مقصود
میں ہوں واما ندۃً منزل یہ گراں جانی ہے
کس کے دم سے ہی نمودِ اثرِ جلوۂ برق
کس کا آئینہ مری سوختہ سامانی ہے
میں ہوں اور جبر کہ ہو قطعِ مسلسلِ رہِ غم
موت وقفہ سہی لیکن کوئی امکانی ہے

حدِ احساس سے اب ہر متجاوزِ غم دل
باش دشواریِ منزل، کہ یہ آسانی ہے

ماسوا اللہ میں دل بھی سی لہی سکن مانی
ماسوا کو ہے فنا، دل بھی کہیں فانی ہو

۱۰۸- غزل

مارچ ۱۹۳۱ء

جس کو تیرا ستم ٹانہ سکا وہی دل تابِ لطف لانا سکا
اُن کو رو درِ ادِ غم ٹانہ سکا میں مستِ در بھی آزمانہ سکا
کچھ نہیں ماجرائے طور و کلیم دل تھا، یا راسے دید لانا سکا
یاد بھی تو نے محو کی میری میں ترا بھولنا بھولنا سکا
بندہ آمینہِ خدا می ہے سجدہ، شانِ جبیں ٹانہ سکا
دل کی تعمیرِ یوں ہوئی ہے کہ عشق ظرفِ کونین میں سما نہ سکا

میں ہوں وہ منظرِ لقا مانی
جس کو دستِ فنا ٹانہ سکا

۱۵۱
۱۰۹-غزل

مارچ ۱۹۳۰ء

سعی مشکور ہوئی آپ کے دیوانوں کی
 خاک ہے دیدہ گردوں میں بیابانوں کی
 ذرہ صحرا ہے نظریں ترے دیوانوں کی
 کنج زنداں میں فضا گم ہو بیابانوں کی
 سب میں معلوم حضورِ مجی حرم کے آداب
 میں نے جاروب کشتی کی ہو صنم خانوں کی
 ہم سے وابستہ ہو اے حسن، ترا حسن شہود
 درخویش، فضا میں ہیں سیہ خانوں کی
 خاک میں ڈھونڈ لے مانی، طلب جاہ سے قبل
 کلنیاں قصیر و نفور کے ایوانوں کی

۱۱۰۔ غزل

اپریل ۱۹۳۰ء

بے تکلف یاس ٹھنچاتی لبِ ساحل مجھے
 آہ لے ڈوبو بامراپند ار جذبِ دل مجھے
 ہاں مٹا دیتا آلِ سعیِ لاحصل مجھے
 وہ تو یہ کہئے، درِ قسمت پہ لایا دل مجھے
 چھٹ کے منزل نے کیا مستغنیٰ منزل مجھے
 کون جانے اب کہاں جا رہا ہو دل مجھے
 میں کبھی باطل کو بھی حق دیکھتا ہوں اور کبھی
 جو حقیقت ہے نظر آتی ہے وہ باطل مجھے
 اور کیا دیتے ازل کے دن، عطا فرما دیا
 ایک نختِ نارِ سا، اک ناشکیبا دل مجھے
 وہم ہستی مجھ کو ہرگز دے نہیں سکتا فریب
 باش لے ذوقِ فنا، معلوم ہو منزل مجھے

ہوشیار بے خودی ہوں، ورنہ راہِ عشق میں
عقل بہکاتی، اگر پاتی کہیں غافل مجھے

۱۱۱۔ غزل

اگست ۱۹۳۳ء

روکشِ سلطنتِ ایازی ہے	واہ کیا شان بے نیازی ہے
لذتِ سجدہ تجھ کو کیا معلوم	یہ مراحق امتیازی ہے
قدرِ میری، ترے ستم سے کھلی	یہ جفا کیا، وفا نوازی ہے
کون ہو جو نہیں ہو سر بسجود	جلوہِ ریزیِ جبین طرازی ہے
جتنا اونچا ہوا ستمِ تیرا	اُتنی ہی میری سرفرازی ہے
وہی دل میں، وہی نگاہوں میں	جو حقیقی، وہی مجازی ہے

چارہ سازی کرو اگر مانی
درد، محتاجِ چارہ سازی ہو

۱۵۲
۱۱۲۔ غزل
نمبر ۱۹۳ء

درد ہی درد ہی دل، درد سے ناشاد نہیں
یعنی اب طاقت فرما ہے، فریاد نہیں
جس میں بھولا تجھے، برباد ہی وہ لمحہ زلیست
زندگی کا کوئی مفہوم کجسریا د نہیں
بال و پر سعی رہائی میں ہوئے نذر قفس
اب جو آزاد ہوا بھی ہوں، تو آزاد نہیں
بے خودی میں نہ تصور ہے نہ احساسِ فراق
یہ وہ عالم ہے اہاں تو ہو، تری یاد نہیں
اُن کو تاکید کی حاجت ہی نہ تھی اے مانی
شیوہ اہل وفا شیون و سرپاؤ نہیں

۱۱۳۔ غزل

دسمبر ۱۹۳۰ء

اندازہ ترا کیا ہے، وہ کیا جانے کیا دے
 رکھ ظرفِ تنہا، یونہی اُس در پہ صدا دے
 حسرت نہیں، حیرت کے لئے جلوہ دکھائے
 آ۔ دریں تنہا نہ سہی، ذوقِ فنا دے
 غم ایک ہی ایسا ہے کہ دنیا کو بھلا دے
 غم کیا ہے وہ نعمت ہے، مگر جس کو خدا دے
 آذر وہ نہ ہو بے حسی صبر و رضا سے
 بیدار نہ کر ترک، یونہی داؤدِ فنا دے
 بیگانگی ہوش ہے عرفانِ محبت
 اور اس سے سوا کیا نگہِ ہوشِ ربا دے
 آ۔ اپنے ساتھ آئے ترے دل میں مری یاد
 یا پھر جو بھلا سکتا ہو مجھ کو تو بھلا دے

مستفنی ساحل نہیں دریائے محبت
 دم لینے کی فرصت بھی کہیں بھوج فنا دے
 جس ذرے کو دیکھوں وہ بنے وادیِ امین
 تارِ قطرہ و برق تجلی کو بلا دے
 اس نقشِ کفنِ پامیں ہی جو رفعتِ پنہاں
 وہ تیری جبین میں ہی، زرا سر تو جھکا دے
 اعجازِ نظر ہے کہ رہی دل میں و گر نہ
 ہے کون جو ذرے کو بیاباں کی فنا دے
 دل منزلِ مقصود سے آگاہ ہے مآتی
 دل ہی نہ بتائے تو تجھے کون تبا دے

۱۱۴ - غزل

دسمبر ۱۹۳۰ء

ہائے وہ دل، جسے اندوہ کا یارا بھی نہ ہو
 مستِ چارہ اندوہ گوارا بھی نہ ہو،

کیوں نہ بے باک ہوں جلوئے کہ نظر قاصر ہو
 اور اگر تابِ نظر ہو، تو تظارِ را بھی نہ ہو
 ہے تغافلِ عزمِ در نہ میں سمجھوں کیونکر
 لطفِ پہناں کا اگر کوئی اشار بھی نہ ہو
 تیرے ہوتے کوئی مفہوم ہے ویرانی کا
 دل تو ہے، چاہے تو اب انجمنِ آرا بھی نہ ہو
 ہر نفسِ خیر سے پیغامِ اجل ہے اور نہ
 کیا ہوا تسکین کا جو یہ ایک سہارا بھی نہ ہو
 جان دینا ادبِ عشق تھا اور سحرِ لطمہ
 میں یہ سمجھا کہ کہیں اُس نے پکارا بھی نہ ہو
 جس کو کہتا ہے وفا، بے کسی مانی ہے
 کس کا ہو کر رہے آخر، جو تمھارا بھی نہ ہو

۱۱۵۔ رموزِ حقیقت

(۱) نیزنگِ ہستی

فروری ۱۹۳۱ء

بنا ہے جس کی عدم، وہ طلسم ہے دنیا
 فریب، روح ہو جس کی، وہ جہم ہے دنیا
 جو کچھ بھی ہے، کبھی مدوم ہو، کبھی مشہود
 زرا نہیں ہے یہاں اعتبارِ بود و نبود
 وہ دولتیں، جنھیں کہتے ہیں لوگ زیرِ حیات
 نہیں کچھ اور بحسبِ زائے فریبِ حیات
 عجیب رسمِ یہاں کی، عجب یہاں کا طریق
 وہ کچھ نہیں ہو، نظر جس کی کر سکے تصدیق
 جو خیر پائی تھی کل، آج ہو گئی مفقود
 وجود جس کا مسلم ہے، وہ نہیں موزِ جود

کسی اصول پہ مبنی نہیں کوئی روداد
 حقیقتیں نظر آتی ہیں کس قدر متضاد
 حیریم عجب جلوہ دارِ بزمِ شہود
 کبھی ہے غیبِ حدودِ شہود میں محدود
 کسی جگہ ہے دلیلِ وجودِ محضِ عدم
 کہیں وجود ہی محتاجِ شانِ کیف و کم
 نہ نعمتوں کے لئے کوئی امتیازِ صفت
 نہ حوصلوں کے لئے کوئی قیدِ شخصیت
 بجائے رحم، کسی کے لئے ہزارِ لام
 کسی کو ملتا ہے تعزیر کی جگہ انعام
 کبھی جزا ہی نہیں رنجِ دُردِ مندی کی
 کبھی سزا ہی نہیں کبر و خودِ پسندی کی
 ہاں انسان ہو اس قدر آزاد
 حریفِ خسرو پر ویز بے نوا فرہاد

کبھی یہ ایسی رسوم و قیود کی پاسبان
کھڑا ہے دورِ صفِ عقبا، یہ اجمند

کہیں نفاق کا نہ ہر اب اور جامِ خلوص
ہیں کینہ پروریاں، اور بچھڑا امِ خلوص

کہیں ہے جلوہ فزا حسنِ اہتمامِ عمل
کہ میں خلوص میں قربانیاں نظامِ عمل

کہیں وفاؤں کے پردے میں ہی جفاکاری
کہیں ہے، لطفِ عیاں میں نہاں دلِ آزاری

یہ حالتیں ہیں، یہ نیزنگیاں ہیں اور جینا
اب اس کو زلیست کہو، چاہے خونِ دل مینا

کسی طرف نہیں تسکین کا کوئی پہلو
تسار کس کو یہاں، لا الہ الا ہو

اک اضطراب ہی فرماں روا کے شام و سحر
ہو عیش و صل میں بھی صدمہ فراق

دل چو قبلہ نما فارغ از پیدن نیت
بغا لے کہ منہم، رسم آرمیدن نیت

استغنا و قدرت

سکونت کی تئنا، اصول کی جو یا
ہناں اصول میں تسکین کا راز ہے گویا
مگر یہ جبر کرے کیسے اختیار پسند
نہیں ہو قدرت مطلق، اصول کی پابند
بلا سے، ہو کہ نہو قلب زاد کو تسکین
مگر قیود ضوابط میں اقتدار نہیں
فلک فلک پہ جدا شانِ جلوہ تازی ہر
جہاں جہاں میں نیاز نگ بے نیاز ہی ہر
ح کہیں اہل مدعا کے لئے
کھلا ہے بابِ اجابت کیس دُعا کے لئے

کسی کوٹ کے ملی زندگانی جاوید
کسی کی نصرت ظاہر نہ ہو سکے، نہ مدد

تنوعات تجلی سے پُرضیا آفتاق
سمجھ ہے میں اشاروں کو چھوٹے عشاق

کبھی صنم کدہ آزری میں ابراہیم
چراغِ دل تہ دامن لئے ہوئے ہیں مقیم

جلالی شمعِ ہدایت کبھی سرِ دربار
کبھی دکھتی ہوئی آگ کو کیا گلزار

دو فورناز کے بے حد و بے شمار گواہ
عیاں زمانے میں ہر قصہ کلیم اللہ

درِ عدو پہ کبھی سعیِ باریابی میں
کبھی پہاڑ پہ اُمیدِ جلولہ تابی میں

خمرِ نہ ہائے کرم زیرِ حکمِ قدرت ہیں
تمام گنجِ حکمِ تابعِ مشیہِ فرانِ ہند

عطاءے خاص سے عفت کو سرفراز کیا
 درویدی کے لئے پیرہن دراز کیا
 یہ جایا کہ پاک باز نہیں
 ثبوت عصمت سیتا میں شت ہوئی ہوزیں
 توافل اور میں الثفات ہناں
 تملطف، اولطف میں قہر کے ساماں
 رواں ہے بحر میں تختے پہ ماں اور اک بچا
 کنارہ دور ہے، دم ٹوٹتا ہو مادر کا
 وہ بے کسی ہے کہ دکھتا ہو موت کا بھی دل
 وہ شیر خوار کہ ہر جس کی زندگی مشکل
 جواں ہوتا ہو ایشانِ خدا دکھاتا ہے
 جاناں بناتا ہو موتی کا در بھی پاتا ہے
 نہیں سکا کہ قصا
 بٹہنچ کے عقدہ پندار کر چکی ہے وا

ہر آنچہ در نظر آید، طلسمِ راز کے است
بہارِ مہتی عالم، فنونِ ناز کے است

(۳) نازِ کبریا

یہ شانِ ناز کی ساری کوشمہ سازی ہے
وہ شانِ ناز کہ تاحدِ بے نیازی ہے
اُسی کے واسطے زیبا ہے کبر و استغنا
جسے نہ دوست کی حاجت نہ خطرِ اعدا
وہ عجزِ خاک ہو یا سرکشیِ نار، مگر
اُس آستانِ مقدس کو نفع ہو نہ ضرر
اگر ہے عقبہِ عالی پہ کوئی سر بسجود
سمجھ کہ سجدی سے ہی رفعتِ جبین مقصود
کہیں اگر نظر آئے مجالِ سربانی
سمجھ کہ معرفتِ نفس کو

جو دم گزرتا ہے، قدرت کی ٹھیل اس کو سمجھ
 کمالِ قہر و غضب کی دلیل اس کو سمجھ
 پناہ مانگی وہ درازی ہو
 جو کارِ آخرتِ تنبیہ بے نیازی ہے
 تمام کبر ہے میانِ شانِ ذاتِ احد
 بشر کے واسطے ہی طوقِ لعنتِ سرمد
 غرورِ شرک ہو، اور شرک باغیانہ گناہ
 اسی گناہ نے ہامان کو کیا ہے تباہ
 زبانِ پشہ سے عمرو کی روایت سن
 دہانِ نیل سے فرعون کی حکایت سن
 طلاؤ فقرہ بہ عنوانِ ننگِ خشت کہاں
 بساطِ ارض پہ شہاد کی بہشت کہاں
 ریت پناہی ہے
 روانہ ظلم نہ پندار بادشاہی ہے

نتیجہ خیر ہے ہر دردِ مظلومی

بقدرِ صبرِ ملی

ہنوز رام کی ذریت اس جہاں میں ہو

کوئی زمین پہ راہ

گزر تو کر بسو درگاہِ حسین شہید

فضا میں ٹہو بڑھتی ہیں لغتیں نشانِ یرید

کم اب بھی شوکتِ دہلی شاہِ طوس نہیں

مگر زمانے میں اب کوئی زارِ روس نہیں

گناہِ بد ہے تعدی خدا کے بندوں پر

ہو اپنی خیر کا طالب، تو اپنے شر سے ڈر

ضرور شانِ رحیمی پہ اعتقاد رہے

خدا رحیم ہے، لیکن یہ بات یاد رہے

عبودیت سے تجاوز کبھی نہیں ہو روا

ہیں قہر و عدل بھی مبرا

بشانِ نازِ چو آہنگِ ترک تاز کند
باط کون و مکاں پائمال ناز کند

۱۱۔ منازلِ معرفت

ب۔ مکاں کی کوئی حقیقت ہو
قیاس و وہم سے بالاتر اُس کی قدرت ہو
یہ کائنات کہ ثابت بھی ہو جو اس کا وجود
تو کچھ نہیں ہے، مگر ایک حکیم کُن کی نمود
یہاں پیغامِ تعمیر ہے، اس میں جودن ہے
نگاہ کر کہ یہ سب شرحِ لفظ ممکن ہے
یہ کائنات کہ کہتے ہیں جس کو بزمِ شہود
بہت عظیم سہی، پھر بھی کب ہے لامحدود
حصا بڑا کمال سہی
ہماری فہم و نظر کے لئے محال سہی

مگر بایں ہمہ سب متاثر تعین ہے
کہ جو بھی ہے وہ یقیناً

بخوم و کوب و ہروہ و زمین و زماں

جیم و خلد و بہار و دگر

بہت اہم، مگر اس بارگاہ میں کچھ بھی نہیں
حقیقت ان کی ہر صفت اک کرشمہ تکوین

شہود ان کا ہی بہانہ شانِ خلائی

حدوث ان کا دلیلِ قدم، ہوا الباقی

کہاں کہاں کوئی دیکھے، کسے کسے سمجھے

ہیں فرے فرے درے میں جلوے وجود واجب کے

دل اور دل کی ہدایت کو شوقِ سادہ ہر

جاں گیا دیں تھا ذکرِ منہرِ دیگر

ہو اسودا نا الحق میں جب قیامِ گزین

سنا کہ دار و رس پر بھی راج

بڑا کچھ اور، تو تھی انتہائے حیرت دید
وہ قطرہ ہائے سیاہی میں شانِ ربِّ مجید

جب؟ ہم ماسوا کا مقام
تو زیرِ آئہِ ہمہ دیکھا کہ آہ تک تھی حرام
عجب محسوسِ حیرتِ دل کو سکتا تھا
پسر کا نام بھی اک باپ لے نہ سکتا تھا

لی جو بعدِ مراحل کے ایک خلوتِ راز
تو ”ما غرتک ربی“ کی آتی تھی آواز
جب اس کے بعد ہوا انتظارِ بانگِ درا

حیمِ قدس سے دل لے سنی اک اور صدا
”پتہ یہ ہے کہ نہیں کوئی کفو ذاتِ احد“

خدا ہی پاک و صمد، لم یلد و لم یولد
”جھک گئی جبینِ نیاز“

کہ تھی یہ منزلِ آخر کی آخری آواز

نہ دامنم ایں کہ چنان ایت اوچاں صفت است
یقین عاجزی فہم حد معرفت است

۱۱۶- غزل

اپریل ۱۹۳۱ء

اے عشق مجھے ہوش سے بیگانہ بنا دے
اس غم کی حقیقت کو اب افسانہ بنا دے
جلوسے کومی، اور شوق کو پیمانہ بنا دے
جو چاہے، مری جرات رندانہ مہرے
غافل نہ ہو، یوں دل کو نہ دیرانہ بنا دے
کعبہ نہیں بنتا تو صنم خانہ بنا دے
عالم کی بہار اُس کا اک انداز جنوں ہے
دیوانہ ہے جلوہ حب
ہے برگِ خراں دیدہ میں دوا دہاراں

تو ہوش سے دیکھے، تو یہ دیوانہ بنا دے
 پہلے مری فردِ غسل کی
 ہر جرم کو اک لغزشِ مستانہ بنا دے
 ۷ ڈریے کہ مراد دل
 اس ڈرے کو اب حشر کا صحرائہ بنا دے
 جب برق نے پھونکا ہے مری قیدِ مکاں کو
 کیوں اپنی تجبلی میں نہ کا شانہ بنا دے
 مانی دہی مستغنی احسانِ اجل ہے
 جس کو وہ نظرِ زیت سے بیگانہ بنا دے

۱۱۷- غزل

مئی ۱۹۳۱ء

فتنا سے پہلے غمِ دل کی انتہا معلوم
 مگر یہ دل بھی مٹے گا کبھی یہ کیسا معلوم
 ہم کہ مطلوبِ دل ہی نامعلوم

دُعا توجب ہو کہ ہو پہلے

بہ اعتقادِ قیامت، امیدِ داد بھی ہے
وگر نہ سوزِ غم، اور
اُس آسماں سے مرا سر اٹے تو کیسے ہٹے
غنی کی شانِ عیاں،

مری خطا کہ نہ صحت ہوئی مجھے، ورنہ
کمالِ چارہ گردِ دردِ دعا معلوم
ستم نہ ترک کرو، زحمتِ ستم نہ کرو

مجھے ہو ظرفِ دلِ دردِ آس
کچھ ایسا غم تھا کہ جاں بر نہ ہو سکامانی
ماں سے ہوا اتنا تو ماجرا معلوم

۱۱۸۔ غزل

اکتوبر ۱۹۳۱ء

ماں غم ہے غم، امیدِ تاثیرِ فغاں کیسی

جنوں، سازِ جنوں ہو، پیرِ جن کی دھجیاں کیسی
 سرانی کا، گم ہیں بھلیاں کیسی
 متنا برق کی رکھتا ہوں، طرحِ آشاں کیسی
 بن کر بھی نہ نکلا رنجِ ناکامی
 مقدر ہو کے رہ جاتی ہے سہی رائگاں کیسی
 کہوں کیا، دل پہ کیا گز رہی ہو اور کیا کیا گزرتی ہو
 کہ تابِ زندگی باقی نہیں، تابِ بیاں کیسی
 مقصودِ سنگِ در، وہی مفہومِ پیشانی
 سلامتِ سجدہ، تمیزِ جبین و آستاں کیسی
 نرِخ آباد آسماں ہو، ورنہ اسے مانی
 قدم رکھتے ہی اتنی شدتِ دردِ نہاں کیسی
 غم ایسا غم کہاں، احساسِ باقی ہو ابھی مانی،
 ابھی بے خود نہیں ہو، ورنہ یہ بے تابیاں کیسی

۱۷۲
۱۱۹- غزل
نمبر ۳۱۹۳

جو سانس ہے، اک منزلِ عرفانِ یقین ہے
 درکار مرے سجدے کو
 اب تک درِ جاناں کے تجسس میں جہیں ہے
 گویا کہ قنارِ فِراقِ گردن سے ہیں ہے
 منزل ہے کہ اب ساتھ مرے کفر نہ دیں ہے
 سب ایک طرف، تیری تمنا
 بقی اک نگہِ ناز تری دولت کو نین
 اب دل ہی، سودینا ہی، تھیر ہی،
 آنکھوں میں ہے دمِ جوشِ تمنا کے قطر سے
 کس درجہ مجھے آپ کے دُعا سے
 دل حیرتی جلوہ ہے، اور جلوہ حیرت
 جس درجہ سے کیا آتش

٢٥
٢٥

1915/2/14

DUE DATE

11/2 1915 APR 14
G.D.
K.P.P. &

Date	No.	Date	No.